ماہنامہ
طلوعِ اسلام
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
لاہور
اکتوبر 2012ء

آبروئے ماز نامِ مصطفیٰؐ است

اسرائیلی نژاد امریکی مصنف اور فلم ساز بدبخت سام بسیلے کی گھٹیا اور دل آزار فلم (Innocence of Muslims) میں قرآنِ کریم اور پیغمبرِ آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (فِداہُ اُمی و اَبی) کی شانِ اَقدس میں جس ذہنی افلاس، نفسیاتی پستی اور باطنی خباثت کا نفرت انگیز اظہار کیا گیا اُس پر دنیا بھر کے مسلمانوں اور پاکستان بھر میں بجا طور پر شدید احتجاج کیا گیا۔ یوں تو متعصب اور اخلاقی پستی کے شکار غیر مسلم اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کرنے پر مسلمانوں کی نفرت کا شکار بنتے رہے ہیں تاہم یہودیوں کی اِسلام دشمنی پرانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی یہودیوں نے مسلمانوں میں فساد پھیلانے اور تفرقہ انگیزی کے لئے جو کچھ کیا اُس کے ذکر سے تو ہزاروں ضخیم کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اسلام کے دیگر مخالفین کی طرح یہودیوں نے اپنی ہر منفی حرکت کا نتیجہ عالمی نفرت کی صورت میں حاصل کیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا، دنیا بھر کے بڑے بڑے مورخین اور مغربی مفکرین بھی اس باب میں رطب اللسان ہیں۔ آپ تمام بنی نوع انسان کے لئے رحمت و رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ اسی لئے آپ کو کَآفَّةً لِّلنَّاسِ اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہا گیا ہے۔ اس طرح کی اوچھی حرکتوں سے آپ کی عظمت اور تقدس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

دنیا کو امن کی ضرورت ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے لئے وسائل کا رُخ انسانوں کی طرف موڑنے کی ضرورت ہے۔ زخم زخم انسانیت مرہم کی متقاضی ہے لیکن ''مغرب'' آزادیٔ اظہار کے نام پر فتنوں اور نفرتوں کی فصلیں بونے والے ہاتھ کو روکنے پر رضامند نہیں ہے۔ امریکہ اور یورپ کے اہلِ علم اور دانش ور طبقہ کو سوچنا ہوگا کہ اس طرح کا فساد فی الارض اور اس طرح کی آتش فشانی کیا نتائج مرتب کر سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی یہ ''دہشت گردی'' اور ''انتہا پسندی'' کی روش نہیں چھوڑیں گے تو دنیا اُن کے لئے بھی امن و سکون کا گہوارہ نہیں بن سکتی۔

ادارہ طلوعِ اسلام اس گھٹیا اور غلیظ فلم کے خلاف سراپا احتجاج ہے اور اُمتِ مسلمہ کے ساتھ ہم آواز ہو کر پُرزور مذمت کرتا ہے۔

(چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو
آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بهاست
یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

فہرست

لمعات: کیا ہم تباہی سے بچ سکتے ہیں؟	ادارہ	3
آپ کے خطوط		5
اقامتِ دین کے قرآنی اصول	خواجہ ازہر عباس	7
اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ	آصف جلیل	14
گاڈ پارٹیکل اور قرآن	راجہ عبدالعزیز خان	19
پرویز صاحب کا نظریۂ تاریخ اسلام	منظور حسین لیل	37
کیا قائداعظم سیکولر تھے؟	ڈاکٹر صفدر محمود	45
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی	حامد میر	62

طلوعِ اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب' دروس القرآن کی تمام جلدیں' اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بک سیلرز' 42' دی مال (ریگل چوک)' لاہور۔ فون: 042-37312977' موبائل: 0300-4442226	
2- البلال بک ڈپو' اردو بازار' کراچی۔ موبائل: 0344-2502141	3- شہباز بک ایجنسی' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32632664
4- مذہبی کتب خانہ' اردو بازار' کراچی۔ موبائل: 0331-2716587	5- شاہ زیب انٹر پرائزز' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32214259
6- علمی کتاب گھر' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32628939	7- مکتبہ دارالسلام' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32212269
8- مکتبۂ دارالقرآن' اردو بازار' کراچی۔	9- محمد علی' کارخانہ اسلامی کتب' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32631056
10- ایوانِ کتب' اردو بازار' لاہور' فون: 0321-8836932	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

لمعات

کیا ہم تباہی سے بچ سکتے ہیں؟

قرآنِ کریم کی رُو سے، کوئی قوم نہ تو یونہی زوال پذیر اور پھر مُردہ ہو جاتی ہے، نہ ہی یونہی عروج آشنا۔ قوموں کے عروج و زوال کے لئے غیر متبدل قوانین مقرر ہیں۔ زوال آمادہ قوم، اگر وہ اُس مقام تک نہیں پہنچ چکی جہاں اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی، تو وہ عروج و ارتقاء کے قوانین کے مطابق اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لینے سے پھر حیات آشنا ہو سکتی ہے۔

قوموں کو اُن کے نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کی رُو سے تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(1) وہ قوم جو علم و بصیرت کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں عالم گیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتی ہے۔ یہ قوم جب تک اس روش پر قائم رہتی ہے دنیا کی کوئی دوسری قوم اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ قرآن کے الفاظ میں یہ جماعتِ مومنین ہوتی ہے جسے اَعْلَوْن کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو الدّین کی حامل قوم کہا جاتا ہے۔

(2) مذہب کو چھوڑ کر، جو قوم، عقل و علم کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے گروہ بندانہ مقاصد کے لئے صرف کرتی ہے، اس کا مقابلہ اسی جیسی دوسری قوموں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ جو قوم اس سے زیادہ قوتیں فراہم کر لیتی ہے وہ اس پر غالب آ جاتی ہے۔ ان اقوام کو سیکولرازم کی حامل کہا جاتا ہے۔ تاریخ عالم، سیکولرازم کی اسی گردشِ دولابی کی داستان ہے۔

(3) جو قوم علم و عقل سے کام نہیں لیتی، اس کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طبیعی زندگی کی ضروریات کے لئے بھی دوسری قوموں کی دست نگر ہوتی ہے۔ یہ بات بالادست قوموں کی مصلحت پر موقوف ہوتی ہے کہ اس

(زیردست) قوم کو کب تک زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ قومیں نہ اپنی زندگی جیتی ہیں' نہ اپنی موت مرتی..... انہیں مذہب پرست اقوام کہا جاتا ہے۔ یہ جب تک مذہب کے ساتھ چمٹی رہیں گی' پستی اور زیردستی کی اسی ذِلت آمیز حالت میں رہیں گی۔

اگر کسی ایسی قوم کے دل میں زندگی اور عروج کی خواہش بیدار رہو' اور وہ اقوامِ عالم میں بلندترین مقام پر پہنچنا چاہے تو اسے مذہب چھوڑ کر قرآن کا اتباع کرنا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر اس کی ہمت نہ پائے تو اسے مذہب چھوڑ کر سیکولرازم اختیار کر لینا ہوگا۔ اس صورت میں وہ مقامِ مومن پر نہیں تو کم از کم مقامِ آدم پر پہنچ جائے گی۔ مذہب تو مقامِ آدم سے بھی پست تر مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ اس میں عقل وفکر کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ وہ علومِ سائنس کی تحصیل کو کفر والحاد قرار دیتی ہے۔ ایسی اقوام کو چمگادڑ کی طرح تاریکی ہی راس آتی ہے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ اگر وہ قوم اپنے اندر اتباعِ قرآنی کی ہمت نہ پائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتباعِ قرآنی اس قدر مشکل ہے کہ اس کے لئے صبر آزما ہمت کی ضرورت ہوتی ہے؟

اتباعِ قرآن تو اس قدر ہمت طلب نہیں ہوتا لیکن جن عقائد ومسالک کو چھوڑ کر قرآن خالص تک آنا ہوتا ہے' ان کو چھوڑنا بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ یہ عقائد ومسالک ایسی قوم کے ہاں صدیوں سے متوارث چلے آتے ہیں..... تمدن۔ تصوف۔ شریعت۔ کلام..... ان سب کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آنا پڑتا ہے۔ کٹھن منزل لا کی ہوتی ہے۔ مذہب پرست قومیں اسی منزل میں کھوئی رہتی اور فنا کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں۔

جس قوم کا مذہب دُوربین کے ذریعے چاند دیکھنے کو بھی ناجائز قرار دے' وہ چاند کو مسخر کیسے کر سکتی ہے؟ اس کا دانشور طبقہ ایسا چاہے بھی تو مذہبی پیشوائیت کی ہنگامہ خیزی اُسے اس کی جرأت نہیں دلائے گی..... لہٰذا' وہ طبقہ سیکولرازم اختیار کر لے گا۔ پہلے سیکولرازم ان کے سینوں کے اندر پرورش پائے گا۔ پھر نمودار ہو جائے گا۔ سپر پاورز کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان ممالک میں مذہب کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں' ان کا مفاد اسی میں ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ کے خطوط

موضوع: دشمن کی زبان سے نظریہ پاکستان کا مفہوم

السلام علیکم۔ نظریہ پاکستان (Ideology of Pakistan) کے مقصود و مفہوم کی تشریح و تعبیر میں اَب تک بہت کچھ احاطہ تحریر میں آ چکا ہے۔ لیکن میری دانست میں ابھی اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ اس نظریے کو اس زاویہ ہائے نگاہ سے پیش کیا جائے کہ اُس وقت کے دُشمنانِ پاکستان اس نظریے کو کس مفہوم میں پیش کرتے تھے۔ اس کی صرف دو مثالیں میرے پیش نظر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

مثال نمبر 1: 1941ء میں لدھیانہ (ہندوستان کا ایک شہر) میں ''اکھنڈ بھارت کانفرنس'' منعقد ہوئی جس کے صدر ''مسٹر منشی'' تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا ''تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے۔ نظریہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن (Home Land) بنا لیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور اُردو زبان ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں ''اسلامی حکومت'' قائم ہو۔ (حوالہ: Tribune مورخہ 02-11-1941' ماہ نامہ طلوعِ اسلام دسمبر 1941ء)

مثال نمبر 2: قائداعظم نے مسلم لیگ کے نصب العین اور پاکستان کے مفہوم کو اس اصرار و تکرار سے دہرایا کہ کسی کو اس کے متعلق کوئی مغالطہ نہ رہا۔ مثلاً 1940ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ کانگریس' مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرے۔ اس پر مسٹر ''ستیہ مورتی'' نے کہا تھا کہ کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت کس طرح بنا سکتی ہے جس کا نصب العین ''اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (حوالہ ہندوستان ٹائمز 11-06-1940)۔

میرا مقصد ان دو مثالوں کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ اس طرح کے بیانات اکٹھے کئے جائیں جن میں ''پاکستان کے مخالفین کی زبان پر بے اختیار نظریۂ پاکستان کی وضاحت ہوتی ہو۔ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے تا کہ وہ عناصر جن کے ذہن پر نظریہ پاکستان کے خلاف بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں اور ہم اُنہیں برملا کہہ سکیں کہ

پتا پتا' بوٹا بوٹا' حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اگر آپ کے علم میں ایسی کتاب ہو تو مطلع فرمائیں۔

(منظور الحسن)

مکان نمبر 111' بلاک نمبر 3' سیکٹر سی وَن
قائداعظم ٹاؤن' لاہور۔ 54770

تعارف: ریٹائرڈ ایڈمن آفیسر (1999ء)
پنجاب یونیورسٹی لاہور

مورخہ: 27 جولائی 2012ء

محترم ایڈیٹر طلوع اسلام

اسلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہٗ

امسال 7 اگست اور 18 رمضان کا اتصال ایک تاریخی عجوبہ بن گیا۔

حضور نبی اکرم جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی 7 اگست 610ء کو نازل ہوئی تھی۔ جبکہ اس وقت عربوں کے سال کے مطابق رمضان کی 18 تاریخ تھی یوں میلادی 41 شمار کیا گیا۔

تقریباً چودہ سو سال بعد یہ حسن اتفاق امسال 7 اگست 2012ء اور 18 رمضان 1433ھ کو دوبارہ برابر آ گیا۔ ہم نے علم وحی کے ساتھ کیا کیا۔ تاریخی اور مشاہداتی طور پر سب کچھ ہمارے حالات کا عکاس ہے۔ دوسری طرف اہل مغرب نے مذہب کے غیر عقلی اور پاپائی لباس کو اتار پھینکا اور عقل انسانی کو کافی جان کر خوب خوب استعمال کیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ جب میں نے 7 اگست 2012ء کا جنگ پڑھا تو اس خبر نے مجھے چونکا دیا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

سرخی: ''خلائی سائنس میں نئی تاریخ رقم' ناسا کی روبوٹ گاڑی مریخ پر اتر گئی''

''کیوروسٹی نے 560 ملین کلومیٹر کا سفر 13 ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے 8 ماہ میں مکمل کیا''

''دو تصاویر جاری کر دیں'' امریکی سائنس دانوں کا جشن''

اوباما کا کامیابی پر خصوصی پیغام''

یہ گاڑی پہاڑ پر چڑھ کر نمونے جمع کرے گی۔ یہ گاڑی پلوٹونیم بیٹری کی مدد سے دس سال تک کام کر سکتی ہے۔ یہ دو سال تک مریخ پر رہے گی۔

اور ہم اس موقع پر نظام ربوبیت کا ایک بلب بھی روشن نہ کر سکے۔

واسلام

ملک حنیف وجدانی
سنبل سیّداں (نیومری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس۔ کراچی

اقامتِ دین کے قرآنی اصول

آپ قائداعظم کا یہ مشہور اور مستند بیان ملاحظہ فرمائیں:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام واصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔'' (روزنامہ انقلاب لاہور' 8 جنوری 1942' ص3)

ہمارے تیرہ سو سال پر محیط سارے اسلامی لٹریچر میں اس درجہ جامع بیان کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ افسوس کہ ہمارے دانشوروں نے اس کی اہمیت ہی نہیں سمجھی۔ اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے سر کے اوپر سے یہ بات گذر گئی۔ تحریک طلوع اسلام' قائداعظم کی حد درجہ عزت کرتی اور ان کے اُن بیانات کو جو قرآن کے مطابق ہوتے ہیں اُنہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہے۔ لیکن اِس تحریک کے نزدیک اُن کا کوئی بیان حجت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک حجت صرف قرآن کریم ہے جو منزل من اللہ وحیٔ الٰہی ہے۔ جو ہر طرح کی غلطی وسہو سے ماورا ہے۔ اور صرف اسی کی اطاعت کا ہمیں حکم ہوا ہے۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (7:3)۔ ترجمہ: (لوگو) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو نازل کیا گیا ہے' اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ جماعت اسلامی بھی چونکہ سیکولر حکومت کی مخالف ہے اور اسلامی حکومت کی قائل ہے اس لئے انہوں نے بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قائداعظم اسلامی مملکت کے داعی تھے۔ اس بیان کو کچھ عرصہ پیشتر اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں طبع کیا ہے۔ لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ قائداعظم کے اس بیان کو روزنامہ انقلاب لاہور نے مورخہ 8 جنوری 1942ء کو طبع کیا تھا۔ جو قیام پاکستان سے تقریباً 5 سال پیشتر کی بات ہے' لیکن جماعت اسلامی نے اُس وقت اس کو درخورِ اعتنا نہ گردانا اور قیام پاکستان کی مخالفت جاری رکھی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے قائداعظم کا یہ بیان قرآن خالص پر مبنی ہے اور پیشوائیت کے نظریات اور تھیوکریسی کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ آپ اس بیان کے بین السطور پر غور فرمائیں وہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ اطاعت قرآن کے ذریعے ہی کی جاسکتی ہے۔ قرآن کے احکامات چونکہ اجتماعی نوعیت کے ہیں اس لئے اس کی اطاعت کے لئے مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مملکت کے قوانین قرآن کریم کی حدود کے اندر ہی وضع کئے جائیں گے۔ اس بیان سے دو باتیں

واضح ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس حکومت کی اطاعت ہی اللہ کی عبادت ہے۔ اس کے علاوہ پرستش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ دوسری بات یہ چونکہ اس کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ اسی لئے اس مملکت میں قانون کا ماخذ صرف قرآن ہوسکتا ہے۔ قرآن کے علاوہ اگر کوئی دوسرا ماخذ بھی شریک کیا جائے تو پھر خالص اللہ کی عبادت نہیں رہے گی۔ اس بیان سے مزید یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ہمارے موجودہ دَور میں مملکت تین طرح کے نظریات پر مشتمل ہوسکتی ہے' مملکت کی ایک طرز تو سیکولرازم ہے جو اِس وقت تقریباً اکثر ممالک میں رائج ہے۔ اس قسم کی مملکت میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوتا' اس مملکت میں فکر انسانی ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرہ کو منظّم و مستحکم کرنے کے لئے کسی قسم کے قوانین بنا سکتا ہے۔ اِس حکومت میں مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ سارا نظام Expediency پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن بعض سیکولر حکومتوں میں معاشرے کی ضرورت کی وجہ سے مذہبی قوانین بھی برقرار رہتے ہیں۔ جس کی ایک واضح مثال بھارت کی مملکت ہے کیونکہ یہ مملکت مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ گذشتہ صدی میں جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا تو اُس وقت اُن کے اپنے ملک انگلستان میں تو سیکولر حکومت تھی لیکن اُنہوں نے مسلمانوں کی سہولت کے پیش نظر اُنہیں مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت دے دی تھی یہ قوانین صرف پرسنل لاء تک محدود تھے۔ بھارت کی حکومت نے انگریزوں کی اسی Policy کو قائم رکھا ہے۔

مملکت کی دوسری قسم تھیوکریسی ہوتی ہے جس میں پیشوائیت کو کلی اقتدار ہوتا ہے۔ پیشوائیت خود اپنے وضع کردہ قوانین اللہ کے نام پر حاوی کرتی ہے۔ حالانکہ اس کی سند اُن کے پاس کوئی نہیں ہوتی۔ اس مملکت میں گذشتہ دور میں وضع کردہ سابقہ قوانین کو جاری کیا جاتا ہے اور وہ قوانین چونکہ عرصہ دُراز کے وضع کردہ ہوتے ہیں' اس لئے وہ موجودہ دَور کا ساتھ نہیں دے سکتے' لہٰذا وہ ایک ایسا منظّم معاشرہ بنانے میں ناکام ہوجاتے ہیں جو موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔ اس مملکت میں سارا زور پرستش پر ہوتا ہے۔ اور تمام وہ کام کئے جاتے ہیں جن سے ان کے خیال کے مطابق آخرت بنتی ہے۔ ایسے کام سرانجام نہیں دیئے جاتے جن سے انسانیت کا حال اور مستقبل روشن ہو۔ پاکستان میں اگرچہ سرکاری طور پر تو تھیوکریسی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جن پر مذہب کا غلبہ ہے اس لئے یہاں تھیوکریسی کے اثرات نمایاں طور پر واضح پائے جاتے ہیں۔

مملکت کی تیسری قسم قرآنی مملکت ہے جس کے داعی اقبال اور قائداعظم تھے اور جس مملکت کے نظام کو قرآن کریم نے دین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد سے چونکہ ہم مسلمانوں میں دین کا تصور محو ہو چکا ہے اور قائداعظم کے اس بیان میں اسی کی وضاحت ہوئی ہے' اسی لئے یہ بیان بڑا فکر انگیز اور معنی خیز ہے۔ پاکستان جن دنوں میں وجود میں آیا تھا وہ بالکل غیر معمولی نوعیت کے اور سخت Upheaval کے دن تھے۔ جن میں فکری عمل اور غور وخوض ممکن ہی نہیں تھا۔ ہماری پیشوائیت' باستثنائے چند پاکستان کے قیام کے خلاف تھی۔ اس لئے وہ تو کوئی فکری Contribution کر ہی نہیں سکتی تھی البتہ اگر علامہ اقبال اس وقت زندہ ہوتے تو وہ قرآنی مملکت کا تصور واضح طور پر اجاگر کرسکتے تھے۔ قائداعظم کے دور تک دین کا تصور عام نہیں تھا۔ یہ تو ان کی اپنی ذاتی فراست اور

بصیرت تھی کہ وہ از خود اس نتیجہ پر پہنچ گئے جو انہوں نے اس بیان میں ارشاد فرمایا ہے' ان کی زندگی کے آخری ایام اور قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پیشتر' تحریک طلوع اسلام' اقامت دین کی دعوت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اِس تحریک نے البتہ دین کے تصور کو اس درجہ عام کیا کہ اب دین کا تصور تقریباً تمام دنیا میں واضح ہو گیا ہے۔ دین کا قیام چونکہ ہماری پیشوائیت کے مفادات کے خلاف جاتا ہے' اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتی ہے۔ اگر ہماری پیشوائیت دین کی اقامت کے خلاف نہ ہوتی تو پاکستان میں اب تک اسلامی مملکت قائم ہو چکی ہوتی۔ اور پاکستان میں جو افراتفری ہے اور انسانیت کی جو تذلیل ہو رہی ہے وہ نہ ہوتی۔ خوب یاد رکھئے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی تکریم ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور اللہ کے نزدیک کسی انسان کی تذلیل سب سے بڑا جرم ہے۔ میزانِ خداوندی میں اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں ہے۔

ہر مملکت کی اساس اس کی آئیڈیالوجی اور اس کے بنیادی نظریات واعتقادات ہوتے ہیں جن کو قرآن کریم نے کلمات اللہ کہا ہے۔ اسلامی مملکت جن کلمات اللہ پر استوار ہوتی ہے ان کا تصور بھی اس کے شہریوں کے سامنے بالکل واضح ہونا چاہئے تاکہ وہ اُن تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں' اور ان کے مطابق ہی سرگرم عمل رہیں۔ اسلامی مملکت کی اساس نفس انسانی کے تصور پر ہوتی ہے۔ ایک مختصر سی تعداد (Atheists) کی چھوڑ کر دنیا کے تمام مذاہب خدا کے وجود اور آخرت کے قائل ہیں۔ اور ہر مذہب میں روح کا تصور بھی موجود ہے۔ مذاہب کا تو انحصار ہی روح' روحانیت اور روح کی نجات پر ہوتا ہے۔ روح کی نجات کا واحد ذریعہ پرستش خیال کیا جاتا ہے۔ روح روحانیت اور پرستش وہ چیزیں ہیں جن کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہوتا ہے۔ ان سب کا مقصد آخرت میں نجات' مکتی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جس قدر کوئی قوم روح روحانیت اور پرستش میں منہمک ہوگی اسی قدر وہ اس دنیا سے کنارہ کشی کرتی چلی جائے گی اور روز بروز زوال پذیر ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم میں روح انسانی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی قرآن نے روح کے تزکیہ کے کوئی طریقے بیان کئے ہیں۔ یہ جو تمام مذاہب والے' اور ہمارے صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ روح کا تزکیہ کرتے ہیں یہ ان کے اپنے وضع کردہ اصول ہیں۔ اور سب قرآن کریم کے خلاف ہیں قرآن کریم نے تزکیہ روح کا کوئی اصول بیان نہیں کیا۔ قرآن میں نہ روح انسانی کا ذکر ہے اور نہ روحانیت کا۔ لہٰذا ان مقاہر اور ان اولیاء اللہ کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اور نہ ہی ان کو وسیلہ بنانے کا امکان' نہ پرستش کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اوراد وظائف کی۔ جس چیز کو تمام مذاہب میں غلطی سے روح انسانی کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے نفس (انسانی) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نفس انسانی کا عقیدہ دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کے نظام میں اس کی جس قدر بھی اہمیت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے یہ انسانی ذات اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ وہ قوت ہوتی ہے جو ہر بچے کو اس کی پیدائش کے وقت عطا کی جاتی ہے۔ جس طرح ہر بچہ جسمانی طور پر ترقی کرتا ہے۔ اس کی یہ ذات بھی ترقی کرتی چلی جاتی ہے بچہ کا جسم طبعی قوانین کے ماتحت ترقی کرتا ہے اور چند انچ سے لیکر وہ چھ فٹ تک ہو جاتا ہے' لیکن اس بچہ کا نفس اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اقدار پر عمل کرنے سے بالیدگی حاصل کرتا ہے۔ نفس انسانی (ذات) کی پرورش اور اس کا تزکیہ کرنا ہی انسان کی زندگی کا مقصد وحید ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وحی الٰہی کی

ضرورت پیش آتی ہے جس میں انسانی ذات کے تزکیہ کے اصول بتائے گئے ہیں۔ وحی خداوندی نے وہ اقدار عطا کی ہیں جن پر عمل کرنے سے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے۔ ان اقدار پر انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا ان پر عمل صرف ایک نظام کے اندر کیا جا سکتا ہے' اس لئے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت پیش آتی ہے۔

نفس انسانی اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی حامل ہوتی ہے اور اُن صفات کو علیٰ حد بشریت اپنی ذات میں پیدا کرنا ہی تزکیہ نفس ہے۔ یہ کوئی صرف ذہنی یا فکری چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں خارجی معیار ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی کام پر آپ کا ردِعمل جس قدر بھی صفاتِ خداوندی کے مطابق ہوگا اُسی قدر آپ کا نفس کا تزکیہ ہوا ہوگا۔ کسی جگہ آپ کو عفو درگذر سے کام لینا ہوگا اور کسی جگہ سخت گیری سے ارشاد ہوتا ہے۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (40:3 ;5:98)۔ اللہ تعالیٰ شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی۔ ہمارے اندر بھی یہ دونوں متضاد صفات ہونی چاہئیں اور ان کا مظاہرہ ان ہی مقامات پر اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح صفات خداوندی کا مظاہرہ ان مواقع پر ہوتا ہے۔

انسانی ذات کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ خیر وشر میں تمیز کر سکے۔ اس صلاحیت کی کمی کو وحی الٰہی پورا کر دیتی ہے۔ خیر وشر کی تمیز صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ ہر وہ کام جس سے نفس انسانی کی پرورش ہوتی ہے وہ خیر ہے اور ہر وہ کام جس سے نفس انسانی میں اضمحلال واقع ہو' وہ شر ہے۔ خیر وشر کا معیار ہی نفس انسانی ہے۔ اگر کوئی شخص نفس انسانی کے وجود کا قائل ہی نہیں ہے تو پھر خیر وشر کا تو کوئی معیار باقی رہتا ہے اور پھر نہ ہی خیر وشر میں تمیز کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی فلاسفرز آج تک خیر وشر Good & Evil کی کوئی تعریف نہیں کر سکتے۔

اسلامی مملکت چونکہ صفاتِ خداوندی کا مظہر ہوتی ہے اس لئے مملکت کی اطاعت کرنے سے ازخود تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے۔ یاد رکھئے کہ انسانوں کی انفرادی اصلاح' یا اقوام کی اجتماعی اصلاح کا دارومدار صرف نفس انسانی (ذات) کا وجود کو تسلیم کرنے پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یا کوئی قوم نفس انسانی کی منکر ہے تو اس کی اصلاح کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔ نفس انسانی کے تصور کی وجہ سے ہی اسلامی مملکت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو حضرات صرف روح کے قائل ہیں' انہیں اسلامی مملکت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو کونوں' گوشوں' اور زاویوں میں پرستش' اور ورد ووظائف اور چلہ کشی سے تزکیہ روح کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔

اسلامی مملکت کی دوسری اساس مکافات عمل کے عقیدہ پر ایمان لانا ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کا مدار ہی اس پر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور یہ تمام نتائج قوانین خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں طبعی دنیا میں ہر عمل کا نتیجہ فوراً سامنے آ جاتا ہے' لیکن نفس انسانی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' اس کے نتیجہ میں یا تو زندگی اگلے مرحلہ میں چلی جاتی ہے یا وہ اسی مرحلہ میں رہتی ہے جسے قرآن کریم جحیم کہتا ہے (22:51 ;5:10)۔ جو شخص زہر کھاتا ہے۔ اس کا اثر فوری طور پر سامنے آ جاتا

ہے' لیکن جو شخص حرام کا مال کھاتا ہے' اس کا اثر مرتب ہونا تو شروع ہو جاتا ہے' لیکن اس کا نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ البتہ جس شخص کا مکافاتِ عمل پر اسی طرح یقین ہے جیسا زہر کے اثر کا ہوتا ہے' تو وہ شخص کبھی بھی حرام مال نہیں کھائے گا۔ مکافاتِ عمل کے اصول کا جس طرح افراد پر اطلاق ہوتا ہے' اسی طرح اس کا اطلاق اقوام پر بھی ہوتا ہے۔ اور مکافاتِ عمل پر ایمان جرائم کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے ارشادِ عالی ہے۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (4:111) ۔ جس نے کوئی برا کام کیا' تو یقیناً اس کا اثر اس کی ذات پر ہوتا ہے۔ اسلامی نظام میں ہر شخص جرائم سے اس لئے اجتناب کرتا ہے کہ اسلامی مملکت کی حکم عدولی اور اِس کے مکافاتِ عمل کی رو سے اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ غیر اسلامی مملکت کی معصیت' مکافاتِ عمل کی رو سے نفس پر' بڑے اثرات مرتب نہیں کرتی' کیونکہ اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوتی۔ اگر مکافاتِ عمل کا عقیدہ پیشِ نظر ہو' تو آدمی ہر طرح کے جرائم سے اجتناب کرتا ہے۔ غیر اسلامی مملکت میں چونکہ یہ عقیدہ پیشِ نظر نہیں ہوتا اس لئے غیر اسلامی مملکت میں جرائم کی روک تھام نہیں ہو سکتی۔ وہاں جرائم کا انسداد صرف قوانین اور قوت کے استعمال کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی اہم ترین اساس اقدارِ خداوندی پر ایمان ہے۔ سیکولر حکومتیں مستقل اقدار کی پابند نہیں ہوتیں۔ ان کے ہاں مستقل اقدار کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اقدار خود بناتی ہیں۔ اور یہ مملکتیں جو اقدار وضع کرتی ہیں وہ پہلے اپنے مفادات پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ سیکولر حکومت کی اقدار کا کوئی تعلق ساری انسانیت کے مفاد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ان کے پیشِ نظر' وقتی' ہنگامی' ملکی اور قومی مفادات ہوتے ہیں خواہ اس قدر سے ساری انسانیت کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچ جائے۔ اس کے برخلاف اسلامی مملکت کی عمارت مستقل اقدار کے گرد گھومتی ہے۔ ان اقدار کے پیشِ نظر ساری دنیا کے انسانوں کا مفاد ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانیت کی راہنمائی کے لئے جو مستقل قوانین اور اصول دیئے ہیں' یہی مستقل اقدار ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما اور اس کا تزکیہ بھی ان مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مستقل اقدار وہ صفاتِ خداوندی ہیں جن کی نمود کرنی انسان کا مقصدِ حیات ہے۔ اقدارِ خداوندی پر عمل کر کے صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں منعکس کرنا ہی قربِ خداوندی ہوتا ہے۔ ان اقدارِ خداوندی یا قوانین خداوندی کا اجراء صرف اسلامی مملکت میں ہی ہو سکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں نہ اقدارِ خداوندی پر عمل ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی قربِ خداوندی حاصل ہو سکتا ہے۔

اسلامی مملکت کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے اس لئے عبادت کا قرآنی مفہوم واضح ہونا ضروری بات ہے۔ عربی لغت میں عبد کے معنی غلام کے ہیں' اس کے معنی پرستش کرنے والے کے نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو حُر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178)۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام۔ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔ اسلامی مملکت کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہے کہ محکومیت قوانین خداوندی کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی' اور اس کا نام خدا کی عبادت ہے۔ اس اصول پر مبنی مملکت' حضور ﷺ نے مدینہ میں قائم فرمائی تھی۔ یہ مملکت دس لاکھ میل پر مشتمل تھی۔ اس میں حضورؐ نے

اپنے مقامی حکام مقرر فرمائے ہوئے تھے۔ (4:59; 4:83; 2:188) ان مقامی حکام کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہی عبادتِ خداوندی تھی۔ اس نظام میں حضورؐ کی یا مقامی حکام کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں تھی۔ بلکہ اس کا مقصد اسی نظام کے ذریعے عبادت خداوندی کرنا تھا۔ یہ بات پیش نظر رکھئے کہ محکومیت میں ہر وقت اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کی عبادت ہو رہی ہے یا نہیں' اور اس کے نتائج برآمد ہو رہے ہیں یا نہیں۔ جبکہ پرستش میں یہ بات نہیں ہوتی۔ پرستش تو صرف ایک ذہنی' داخلی Subjective چیز ہوتی ہے۔ ہر پرستش کرنے والا دل میں بالکل مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے پرستش کر لی ہے۔ نیز یہ کہ پرستش کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے۔ اگر پانچ وقت کی نماز سے تسکین نہیں ہوتی تو تہجد' نوافل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' تسبیح' ہزارے' اوراد و وظائف' اعتکاف جیسی پرستش کی رسوم شروع ہو جاتی ہیں' اور قوم ان میں ہی منہمک اور مصروف ہوتی چلی جاتی ہے۔ تصوف اس کی شاید آخری شکل ہے۔ البتہ پرستش کے جذبہ میں کشش بہت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونبی بیک وقت بنی اسرائیل کی راہنمائی فرما رہے تھے۔ اور بڑی حد تک ان کی تربیت بھی کر چکے تھے۔ لیکن جب حضرت موسیٰ چند روز کے لئے بنی اسرائیل سے دور ہوئے تو سامری نے بنی اسرائیل کو گئوسالہ کی پرستش پر آمادہ کر دیا۔ کیونکہ پرستش کا جذبہ دل سے مشکل سے نکلتا ہے۔ خوب یاد رکھیں کہ دین میں کسی قسم کی پرستش کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دین میں خدا پرستی سے مقصود ہوتا ہے۔ خدا کے قوانین کو دنیا میں نافذ کر کے اس کی محکومیت اختیار کرنا' اور نیک عملی کے معنی ہوتے ہیں ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ پرستش کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو سکتی۔ سارے سال تجارت میں ناجائز منافع کمانے کے بعد' رمضان کے مہینہ میں غربا کی افطاری کرانا' عمرے کرنا' پرستش میں شامل ہے' لیلۃ القدر کا اہتمام کرنا تمام ٹی وی چینلز پر رمضان کے دوران یہ تمام اسلامی پروگرام نشر کرنا اس پرستش میں داخل ہے۔ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ قوم کے زوال و ادبار میں سب سے بڑا کردار پرستش کا ہوتا ہے۔ اور دین کے قیام میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔

قرآن کریم کا ایک واضح اصول و قانون ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہِ راست نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا واحد ذریعہ رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ **مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ** (4:80)۔ (ترجمہ) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے لئے' حضورؐ کی کی اطاعت کا درمیانی واسطہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضورؐ کی حیات مبارکہ کے دوران حضورؐ کی اطاعت کرنا آسان تھی۔ جو لوگ مدینہ میں تھے وہ براہ راست بالمواجہ حضورؐ کی اطاعت کرتے تھے۔ لیکن جو آبادی مدینہ کے باہر دور دور مقامات پر پھیلی ہوئی تھی وہ حضورؐ کے مقرر کردہ مقامی نظام (4:59; 4:83; 2:188)۔ کے احکامات و فیصلوں کی اطاعت کرتے ہوئے' حضورؐ کی اطاعت کر رہے تھے۔ سارا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضورؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ ہماری پیشوائیت نے حضورؐ کی اطاعت کو ذاتی اطاعت قرار دے کر روایات کے ذریعے حضورؐ کی اطاعت کرنا شروع کر دی اور نظام کی ضرورت سے قطعی انکار کر دیا' اور یہاں سے مذہب اور پرستش کی راہ ڈال دی گئی۔ جبکہ قرآنِ کریم کے

نزدیک حضورؐ کی یہ اطاعت ذاتی، یا وقتی اطاعت نہیں تھی بلکہ یہ اس نظام کی اطاعت تھی جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا اور یہ اطاعت اب بھی صرف اس نظام کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے، اسلامی نظام کا سربراہ جو ایک محسوس جیتی جاگتی اتھارٹی ہوتا ہے، اور جو قرآنی احکامات جاری کرتا ہے۔ اس سربراہِ مملکت کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور یہ دین ہے۔ جب تک آپ روایات کو حضورؐ کی اطاعت کا ذریعہ قرار دیں گے۔ دین کا نظام کسی طرح بھی قائم نہیں ہوسکتا۔ روایات ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن یہ روایات نہ تو وحی الٰہی ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعے اطاعت رسول ہوسکتی ہے روایات صرف دین کی تاریخ ہیں۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

جو لوگ اس نظام کو چلاتے ہیں یا اس نظام کے کارکن ہیں، اس نظام میں عملی سیاست میں حصہ لیتے ہیں، وہ سب عبادت خداوندی کرتے ہیں۔ وہ ذرائع وسائل جو کائنات میں اللہ تعالیٰ کے پروگرام کو چلا رہے ہیں۔ خارجی کائنات میں اُنہیں ملائکہ کہا گیا ہے۔ اور جب اسلامی نظام قائم ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کے پروگرام کو آگے بڑھانے کا ذریعہ وسیلہ ہے، جو لوگ اس حکومت و نظام کے قیام اور اس کے چلانے کے ذمہ دار ہوں گے، وہ حاملین عرش الٰہی ہوں گے، اس مملکت کا کانسٹی ٹیوشن صرف قرآن ہوتا ہے اور کوئی دوسرا کانسٹی ٹیوشن بنانا شرک ہے۔ اس میں شرعی عدالتیں الگ نہیں ہوتیں۔ اس مملکت کی ساری عدالتیں شرعی عدالتیں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک اجتہاد کوئی انفرادی چیز نہیں ہے۔ اسلامی نظام جو نئی پالیسی اختیار کرتا ہے، یا نئے نئے احکامات جاری کرنا ہے، یہی اجتہاد ہوتا ہے پرائیویٹ یا ذاتی اجتہاد کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ ہمارے تمام مروجہ فقہ ذاتی آراء کا مجموعہ ہیں۔ چونکہ وہ کسی اسلامی مملکت کی طرف سے جاری کردہ احکام نہیں ہیں اس لئے وہ قوانین قطعاً اسلامی نہیں ہیں۔ اس مملکت میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوسکتا۔ نہ کسی کو استثناء حاصل ہوسکتا ہے۔ نہ اس مملکت کے سربراہ یا اعلیٰ حکام کو کوئی خصوصی رعایات ملتی ہیں۔ اس مملکت کی دو ایسی واضح حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ایک تو اس مملکت کے شہریوں کو اسی مملکت کے قانون کی صداقت پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کیونکہ وہ وحی الٰہی پر مبنی ہوتا ہے۔ دوسرے اس مملکت کے حکام ایسے فیصلے کرتے ہیں کہ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65)۔

(ترجمہ) پھر تیرے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور خوشی خوشی اسی کو تسلیم کرلیں۔

قائداعظم کے بیان کا انگریزی الفاظ بھی پیش خدمت کئے جاتے ہیں تاکہ انگریزی خواندہ حضرات خود ان کو ملاحظہ فرمالیں:

In Islam, the ultimate obedience belongs to God alone the only way to follow his guidance is the Holy Quran. Islam does not preach obedience to a king, parliament, person or any institution. The Islamic government means Rule of the Quran. And how can you establish Rule of the Quran without an independent state. In this state legislation will take place in the boundaries drawn by the Quran.

M.A. Jinnah
An Interview to Usmania university students, Hyderabad Daccan.

آصف جلیل۔ کراچی

اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ

اللہ تعالیٰ کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، ان کے بارے میں ہمارے مذہبی رہنما یہی بتاتے ہیں کہ یہ بابرکت نام ہیں۔ اس لئے یا تو انہیں خوشنما انداز میں لکھ کر فریم میں مزین کر کے گھر کی دیواروں کی زینت بنایا جاتا ہے یا زبان سے ان کا ورد کیا جاتا ہے۔ آج کل کمپیوٹر کی سکرین پر یہ نام باری باری آتے ہیں۔ بعض مساجد کے میناروں پر بھی یہ نام نظر آتے ہیں۔ مفکر قرآن علامہ پرویز علیہ الرحمہ نے ان صفات کا یہ مقصد بیان کیا ہے کہ ان میں سے چند ایک تو صرف اللہ کے لئے مختص ہیں۔ باقی صفات افراد کے لئے بھی ہیں جنہیں انسانی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنانا چاہیے، لیکن دراصل یہ اس مملکت کے لئے ہیں جو اللہ کے قانون کے مطابق قائم کی جائے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ عوام کی اکثریت لاعلمی کی وجہ سے اللہ کی متعدد صفات کے ان عظیم فوائد اور مقاصد سے محروم ہے۔ آج کل حالات کے تناظر میں دیکھئے کہ علیم ہونا ہمارے لئے کس قدر آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔ علم کے معنی محض جان لینا نہیں ہیں۔ علم اس وقت علم کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے۔ وحی الٰہی کو بھی علم کہا گیا ہے۔ (لغات القرآن)

انفرادی طور پر جیسے جیسے آپ کے علم کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے آپ اس سے مستفیض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ **قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ** [39:9] (کہو کہ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟ جو لوگ عقل و دانش سے کام لیتے ہیں وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ بے شمار غلط کام اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے نتائج سے باخبر نہیں ہوتے۔ علم وہی منفعت بخش ہوتا ہے جو انسانیت کی بہتری کے لئے ہو نہ کہ تباہی کے لئے۔ علم کی بدولت جہاں ہم بے شمار فوائد حاصل کر رہے ہیں وہاں اس کے غلط استعمال کی وجہ سے لوگوں کی ہلاکت بھی ہو رہی ہے اور ان کا استحصال بھی۔ لہذا سائنسی علوم کو اللہ کی وحی (کتاب اللہ) کی روشنی میں استعمال میں لانا چاہئے۔

اب ذرا اس صفت کا اطلاق مملکت پر کر کے دیکھئے کہ کس قدر آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آج تو سائنسی انقلاب کی وجہ سے معلومات کا ضخیم خزانہ آپ کی دسترس میں بآسانی آ جاتا ہے۔ لیکن ہر دور میں علم کے جو بھی ذرائع میسر تھے انہیں استعمال میں لاتے ہوئے ان سے فوائد حاصل کئے جاتے تھے۔ صرف پچاس سال ہی پیچھے جائیں تو دیہاتوں میں لوگ ایک دوسرے کے متعلق اچھی

طرح جانتے تھے کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ اگر کوئی اجنبی داخل ہوتا تھا تو فوراً پہچان لیا جاتا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے۔ کسی کو اپنے گاؤں میں جرم کا ارتکاب کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ سب کو علم ہو جائے گا اور بدنامی ہوگی۔

آج کے دور میں کمپیوٹر کی مدد سے ہر طرح کی معلومات کا ذخیرہ کرنا اور انہیں استعمال میں لانا نہایت آسان ہو گیا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک ہر شعبہ میں اس سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد اپنے عوام کے لئے آسانیاں پیدا کرنا ہے۔ اور روکاوٹیں ختم کرنا ہے۔ ان ممالک کے نظام پر ہم لوگ رشک کرتے ہیں۔ ہر کسی کی کوشش ہے کہ وہ ان میں سے کسی ملک میں جا کر بس جائے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سب اللہ کی صفت علیم سے مستفیض ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ سب قرآن کریم کو پڑھ کر تو حاصل نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر مشکل کا سب سے بہتر حل بتایا گیا ہے۔ چاہے یہ براہ راست قرآن سے لیا جائے یا تجربات کرنے کے بعد، حل وہی ہوگا۔ اس کے برعکس نہیں۔

قرآن کریم کی صفت علیم کے ساتھ اور بھی صفات بیان ہوئی ہیں یا اس صفت کو مزید وسعت دی گئی ہے۔ کئی مقامات پر آیا کہ **واللّٰہ سمیع علیم** ۔یعنی اللہ جاننے والا اور سننے والا ہے۔ جہاں بھی انسانی معاملات میں فیصلہ کرنا ہو، ان دو صفات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جو بھی متعلقہ فریق ہوں ان کا موقف توجہ سے سننا اور پھر حقائق کی تہہ تک پہنچنا۔ ہمارے مروجہ نظام میں جج صاحبان وکلاء کی بحث سن رہے ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر فیصلہ دیا جاتا ہے۔ ان میں حقائق کو جاننے کے پہلو کو بوجوہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اکثر بے گناہ جیلوں میں پڑے رہتے ہیں اور جرائم پیشہ رہا ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ **واللّٰہ علیم بالظالمین**۔ظلم کے بنیادی معنی ہیں کہ جس شے یا فرد کو جہاں ہونا چاہیے وہاں نہ ہو۔ اس جہت سے فرد یا مملکت کے لئے ضروری ہے کہ کسی فرد کو کوئی بھی ایسی ذمہ داری نہ سونپی جائے جس کی وہ اہلیت اور صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس اصول پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کے بارے میں مکمل معلومات دستیاب ہوں۔ کمپیوٹر کے ذریعے ظالمین کی شناخت بآسانی ہو سکے گی کہ کسی بھی عہدے کے لئے جو بھی شرائط مقرر ہیں ان کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔ ظاہر ہے یہ کام وہ فرد یا حکومت کرے گی جو خود ظالم یعنی نا اہل نہ ہو۔ اللہ کے احکام پر عمل درآمد اسی وقت ہو سکتا ہے جب مملکت کے تمام قوانین صرف قرآن کریم سے مستنبط ہوں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں یہ بآسانی نظر آتا ہے کہ کس طرح اقربا پروری اور بدعنوانی کے بل بوتے پر کس طرح کے نا اہل اور بددیانت افراد حکومتی اداروں میں براجمان ہیں۔

اللہ کے بارے میں یہ بھی آیا ہے کہ ان اللّٰہ بکل شیء علیم۔اس صفت کا اطلاق افراد یا حکومت پر اس طرح ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ معلومات کے حصول کو یقینی بنایا جائے۔انفرادی طور پر ہمیں کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مکمل معلومات حاصل کرنا چاہیے۔کم علمی کے باعث قائم کی گئی رائے اکثر غلط ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ایک کم آمدنی والے شخص کو نئی گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ کر یہ رائے دینا کتنا صحیح ہوسکتا ہے کہ یا تو اس نے چوری کی ہے یا اس کی لاٹری نکل آئی ہے۔حالانکہ مزید معلومات حاصل کرنے سے اصل حقیقت سامنے آسکتی ہے۔اگر حکومتی سطح پر ہر شخص کے بارے میں تمام معلومات ہوں جو نہ صرف اس کی شناخت کے لئے ضروری ہوں بلکہ اس کا ذریعہ معاش، ذاتی ملکیت اور بینک میں جمع شدہ رقم بھی معلوم ہو تو اچانک بڑی رقم خرچ کرنے والے سے پوچھ گچھ کی جاسکتی ہے کہ وہ اس کے پاس کہاں سے آئی۔

وطن عزیز میں تو حکمرانوں کا مقصد ملکی وسائل پر ہاتھ صاف کرنا ہے اور عوام کے لئے مشکلات بڑھانا ہے۔ہر شعبے میں بدعنوانیاں اپنے عروج پر ہیں۔اس لئے کمپیوٹر سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جارہا۔کس کے پاس بنگلے، گاڑیاں، زمینیں، پلاٹ اور بینک بیلنس ہے اور کتنا ٹیکس دیا جارہا ہے آسانی معلوم ہوسکتا ہے۔لیکن چونکہ بڑے بڑے لوگ ٹیکس چوری کرتے ہیں، اس لئے ایسا کیا نہیں جارہا۔ اسی سے تمام اشیاء کی ملکیت کا ریکارڈ بھی درست رہ سکتا ہے جس کی بدولت ناجائز قبضہ کرنا ناممکن ہوجائے گا۔مگر جہاں قبضہ گروپ کو سیاسی سرپرستی حاصل ہو وہاں دولت کے سرچشمے کو بند کیوں کیا جائے۔

کئی برسوں سے ملک میں دہشت گردی کے واقعات ہورہے ہیں، لیکن ان پر قابو نہیں پایا جاسکا۔اس کی ایک وجہ تو رشوت ستانی ہے۔پولیس والے پیسے لے کر مجرموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔بعض واقعات میں بارود سے بھری گاڑیوں کو ٹکرا کر دھماکے کئے گئے ہیں۔یہ منظر ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ پولیس والوں نے ٹرکوں، بسوں، موٹر سائیکل والوں کو روک کر رشوت لینے کے بعد چھوڑ دیا۔جو رشوت نہ دے، اس کا چالان کاٹ دیا جاتا ہے۔بارود سے بھرے ٹرک بھی اسی طرح پولیس والوں کی گرفت سے بچ کر جائے وقوع پر پہنچتے ہیں۔ جب تک رشوت کا یہ شیطانی چکر روکا نہیں جائے گا۔دہشت گردی کو روکنا ممکن ہی نہیں۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ ''علیم بالمفسدین'' کی صفت سے استفادہ کرتے ہوئے سب سے پہلے ہر شخص کی شناخت کو یقینی بنایا جائے۔ جب بھی کوئی واقعہ ہوجاتا ہے اس کے بعد کچھ دنوں تک پولیس والے سڑک سے گذرنے والوں میں سے اپنے تئیں جسے مشکوک سمجھتے ہیں روک لیتے ہیں۔اس طرح دہشت گرد تو ہاتھ نہیں لگتے البتہ اکثر بے گناہ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رقم بٹور لی جاتی ہے۔دہشت گرد کہیں فضا میں تو نہیں رہتے۔اہم بات یہ ہے کہ ان کے ٹھکانوں کا پتہ لگایا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام عمارتوں اور مکانوں میں رہنے والوں کی شناخت کی جائے اور ان کے

بارے میں معلومات کمپیوٹر میں محفوظ کی جائیں۔ اگر کسی جگہ لوگ اپنی فیملی سے الگ رہ رہے ہوں تو ان پر نظر رکھنی چاہیے کہ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے اور وہ اس شہر میں کیوں رہ رہے ہیں۔ جو بھی مکان کرائے پر دے وہ کرائے دار کے بارے میں معلومات متعلقہ معلومات کے مرکز کو فراہم کرے۔ اگر کسی بھی شہر میں رہنے والے ہر فرد سے متعلق معلومات محفوظ ہو جائیں تو بہت سے وہ لوگ سامنے آئیں گے جو غیر ملکی ہیں اور غیر قانونی طور پر رہ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو مشکوک افراد میں شامل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو بظاہر کوئی کام نہیں کرتے لیکن ان کا رہن سہن مال داروں جیسا ہو۔ یا وہ جن کے گھروں میں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہو، خاص طور پر رات کے وقت۔ اسی طرح ملک میں فساد کرنے والوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ جرائم پیشہ ہوں یا دہشت گرد۔

اللہ کی صفت ''واسع علیم'' کے تحت معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں نت نئی اشیاء سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کراچی میں دہشت گردی کے واقعات کی روک تھام کے لئے کئی مرتبہ سڑکوں پر کیمرے لگائے گئے جو صرف مخصوص علاقوں میں ہیں اور اکثر خراب ہیں۔ اگر یہ صحیح حالت میں ہوں اور ان کا دائرہ تمام علاقوں تک پھیلا ہو تو ان کے ذریعے تمام شہر کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ اور کسی بھی ناخوشگوار واقعے کی صورت میں فوری طور پر مجرموں کا پیچھا بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی شناخت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انگلیوں کے نشانات کے ذریعے متعلقہ فرد کے بارے میں فوری طور پر معلومات دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کے مابین معلومات کا تبادلہ کرنے سے مجرموں کی گرفتاری اور چوری کی گاڑیوں کا سراغ لگنے میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن اگر تمام وسائل حکمرانوں کی عیاشی پر صرف ہو جائیں تو ایسے امور پر توجہ کیسے دی جا سکتی ہے۔

''علیم حکیم'' کا مطلب ہے جو بھی معلومات میسر ہوں ان کا استعمال حکمت پر مبنی ہونا چاہئے۔ ایسی معلومات کا غلط استعمال روکنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں لگ جائیں تو وہ عوام کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا نہ صرف ایسی معلومات کی حفاظت ضروری ہے بلکہ حکومتی اہل کاروں کی طرف سے ان سے ناجائز استعمال بھی روکنا ضروری ہے۔ محض محدود علم کی بنیاد پر کسی غلط نتیجے پر پہنچنا ایک شریف انسان کے لئے باعث زحمت ہوتا ہے۔ پولیس محض شک کی بنیاد پر لوگوں کو حراست میں نہ لے بلکہ پہلے مکمل معلومات حاصل کرے اور مکمل تحقیقات کے نتیجہ میں اگر کوئی شخص مجرم قرار پائے تو اسے گرفتار کیا جائے تاکہ بے گناہوں کو تنگ نہ کیا جا سکے اور جرائم پیشہ کھلے عام نہ پھرتے رہیں۔

''علیم بما یعملون'' کی صفت کے ذریعے تمام افراد پر نظر رکھی جا سکتی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے چاہے اس کا تعلق حکومتی

ادارے سے ہو، کاروباری یا تجارتی ادارے سے ہو یا کسی بھی پیشے سے ہو۔اس طرح یہ ممکن ہو سکے گا کہ کہیں بھی کوئی بدعنوانی، ناجائز منافع خوری، دھوکہ دہی یا کسی اور ایسے کام میں ملوث ہو جس سے ملک یا عوام کا نقصان ہو سکتا ہو تو اس کا فوری طور پر تدارک کیا جائے۔ کمپیوٹر کو اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو حکومتیں عوام کے لئے آسانیاں پیدا کرتی ہیں وہ اس کا بہت اچھا استعمال کر رہی ہیں۔ ہر محکمے سے متعلق اون لائن شکایات درج کرنے کا نظام ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے کہ اس شکایت پر جو کاروائی کی گئی ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔ شکایات درج کرانے سے متعلق حکومتی اعلانات آتے ہیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا نہ شکایت کنندہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شکایت کیوں دور نہیں کی گئی۔

ایک صفت ''علیم بذات الصدور'' بھی ہے۔ ہر انسان کیا سوچ رہا ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جان سکتا ہے لیکن انسانوں کی سطح پر یہ تو ممکن ہے کہ ان کی باتوں سے اس کا اندازہ لگایا جائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں کسی طرح بھی دولت کمانا چاہتا ہوں۔ اس جملے سے اس کی سوچ اور رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قبل اس کے وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا سکے، اس کی منفی سوچ کو درست کرنے کے لئے اس کو سمجھانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ماہرین نفسیات سے استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم پولیس کے محکمے میں ان کی کچھ تعداد ضرور ہونی چاہئے۔ اسکولوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی بہت ضروری ہے تا کہ بچے مثبت سوچ لے کر پروان چڑھیں اور معاشرے میں غلط رجحانات پنپ نہ سکیں۔

قرآن کریم میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ کوئی اس کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ اسے محض ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے یا یہ حلف اٹھانے اور استخارہ کرنے کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ''وَ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا'' جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔ ایک ضرب المثل ہے جہاں چاہ وہاں راہ۔ موجودہ نظام میں حکمرانوں کی ترجیحات میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر عوام کی بہبود اور ان کو سہولتیں مہیا کرنے کے بارے میں ان کے پروگرام میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ بظاہر وہ کام جنہیں عوام کے لئے کیا جاتا ہے دراصل ان میں اپنا مفاد شامل ہوتا ہے۔ تبدیلی راتوں رات تو نہیں آ سکتی۔ لہذا جو لوگ قرآن کریم کو سمجھنے کا دعوی کرتے ہیں انہیں سب سے پہلے خود اس پر عمل کرنا ہوگا اور پھر اس پیغام کو حکمت کے ساتھ اور غیر ضروری بحث و جدل کے بغیر لوگوں تک پہنچاتے رہنا چاہئے تا کہ وہ جان سکیں کہ ان کی فلاح و بہبود کیسے ممکن ہو سکے گی۔

راجہ عبدالعزیز خان دھیر کوٹ آزاد کشمیر

گاڈ پارٹیکل اور قرآن

اس کرہ زمین میں انسان واحد مخلوق ہے جسے زندگی گزارنے کے لیے ہدایت وراہنمائی خارج سے Objectively ملتی ہے۔ باقی تمام مخلوقات کو زندگی گزارنے کے لیے یہ ہدایت ان کے اندر ہی رکھ دی جاتی ہے۔ جسے ان کی فطرت یا جبلت کہا جاتا ہے۔ یہ فرق اس لیے رکھا گیا ہے کہ انسان کے لیے اس دنیاوی زندگی کے بعد اخروی زندگی بھی ہے اور وہ اپنی مرضی سے اس ہدایت پر عمل کر کے زندگی کے اگلے ارتقائی مرحلے میں پہنچ سکتا ہے۔ اس قانون کے مطابق قرآن کریم نوع انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے جو اسے اللہ کے آخری نبی ﷺ کی وساطت سے ملا ہے۔ قرآن پاک میں کسی قسم کا ابہام، التباس، تضاد، اختلاف، تناقص، نفسیاتی الجھن یا کسی قسم کا اضطراب نہیں۔ اس میں انسانی زندگی کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی اور قوموں کے عروج وزوال کے قوانین موجود ہیں۔ انبیاءؑ کی طرف نازل شدہ وحی کو ان کی کتاب کہا جاتا ہے۔ نبی آخر الزماںؐ کی طرف بھیجی گئی وحی قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے۔ یہ کتاب مکمل اور غیر متبدل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔ ''ہم نے اس کتاب کو جو مبنی برحقیقت ہے تیری طرف نازل کیا ہے تا کہ نوع انسانی اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ ان سے کہہ دو جو اس سے راہنمائی حاصل کریگا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا اور جو دوسرے راستے اختیار کر کے گمراہ ہوگا اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا''۔ 39/41

انسانی استدلالی علم چونکہ ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے اس لیے انسانی عقل غلط یا صحیح، حق و باطل یا خیر وشر کو پرکھنے کا معیار نہیں بن سکتی۔ اس کا معیار علم وحی ہے اس لیے انسانی عقل کو صحیح فیصلہ پر پہنچنے کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وحی کا منبع علم الٰہی ہے جو لامتناہی (Infinite) اور ماورائے زمان ومکان ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور حتمی ہے۔ لہذا کائنات سمیت تمام دیگر شعبوں سے وابستہ انسانی نظریات اور تصورات تبھی صحیح ہو سکتے ہیں جب قرآن پاک ان کی تصدیق کرے۔ کیونکہ ''فلسفہ کی طرح نبوت بہانہ نہیں بناتی کہ وہ معلوم سے غیر معلوم کی طرف انسان کو لے جاتی ہے بلکہ وہ آشکارا طور پر حقیقت کائنات کے ایک تصور سے آغاز کرتی ہے جو

درحقیقت صحیح ہوتا ہے''۔(قرآن اور علم جدید از ڈاکٹر رفیع الدین) ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جو نظریہ، تصور یا کوئی اور حقیقت (جسے وہ علمی صداقت کہتے ہیں) قرآن مجید کے مطابق ہو اسے ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے خواہ اس کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو کیونکہ ''یہ علمی صداقتیں دراصل قرآن کی بکھری ہوئی اور ظلمت کفر میں کھوئی ہوئی کرنیں ہیں۔ان حقائق کی مدد سے ہم مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کی تردید کر سکتے ہیں''۔(ایضاً صفحہ 115)۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے اکثر لوگ قرآن مجید کی صداقت اور حقانیت کو تسلیم نہیں کرتے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ قرآن میں کوئی تضاد یا تناقض ہے بلکہ اس کی کچھ اور وجوہات ہوتی ہیں جن میں ایک اہم وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے متعلقہ ان لوگوں کی معلومات حقائق پر نہیں زیادہ تر سنی سنائی داستانوں پر مبنی ہوتی ہیں۔حالانکہ اگر یہ لوگ تعصب و بغض سے ہٹ کر قرآن مجید میں غور وفکر کر کے اس کے پیش کردہ دعاوی کو Test کریں تو سچائی نکھر کر ان کے سامنے آجائیگی۔اس کی عملی مثال فرانس کے ایک عیسائی عالم، مفکر و محقق ڈاکٹر موریس بقائی نے بتائی ہے۔انہوں نے سائنس اور تاریخ کو بنیاد بنا کر بڑی محنت اور تحقیق کے بعد The Bible, the Quran and Science کے نام سے ایک علمی کتاب شائع کی تھی جس میں انہوں نے الہامی کتابوں میں موجود مواد پر بے لاگ مگر دیانتدارانہ تجزیہ کیا اور کھلے دل سے تسلیم کیا ہے کہ

"As we shall see later on, the Quran deals with many subjects of interest to science Far more in fact than the Bible. There is no comparison between the limited number of Bublical statements which lead to a confrontation with science and the profusion of subjects mentioned in the Quran that are of a scientific nature, non of the latter can be contested from a scientific point of view this is the basic fact that emerges from our study".

ڈاکٹر بقائی مزید لکھتے ہیں۔

"The Quran did not contain a single statement that was assailed from a

modern scientific point of view".

ان کی پوری عبارت کا ترجمہ یوں ہے ''قرآن پاک میں مقدس بائبل سے کہیں زیادہ سائنسی دلچسپی کے مضامین زیر بحث آئے ہیں۔ بائبل میں یہ بیانات محدود تعداد میں ہیں لیکن سائنس سے متبائن ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن پاک میں بکثرت مضامین سائنسی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے دونوں کا مقابلہ نہیں۔ موخرالذکر میں کوئی بیان بھی ایسا نہیں جو سائنسی نقطہ نظر سے متصادم ہو۔۔۔۔ جب میں نے گہری نظر سے عربی زبان میں اس کے متن کا مطالعہ کیا اور ایک فہرست تیار کی تو مجھے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اس شہادت کا اقرار کرنا پڑا جو میرے سامنے تھی کہ قرآن میں ایک بھی ایسا بیان نہیں ملا جس پر جدید سائنسی نقطہ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جو ہمارے جائزہ لینے سے ابھر کر سامنے آئی ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی جملہ موجودات کی کیفیات اور ماہیت نیز اس کے خواص و جواہر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان میں رکھ دی ہے۔ اب اپنی ان صلاحیتوں کی نشوونما کر کے علم حاصل کرنا انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ یہ استدلالی علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس بارے میں فلسفہ کے دو مکاتیب فکر کے درمیان زمانہ قدیم سے بحث و نزع کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک طرف حسیت پسند یا مادہ پرست ہیں جن کا تعلق سائنس سے ہے اور یہ مادہ کو حقیقی اور ذہن کو اس کی نمود سمجھتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف مثالیت پسند یا عقل کے حامی ہیں ان کا تعلق مذہب سے ہے اور یہ ذہن کو حقیقی اور مادہ کو اس کا عکس سمجھتے ہیں۔ سید علی عباس نے طالیس، اناکسی مینڈر، ایمپے دکلیس، زینوفنیس، دیما قریطس اور لیکریشن کو حسیت پسند اور افلاطون، فیثا غورث، پارمی نائیڈس، ایکٹوناس، سپینوزا، ذینوالیاطی، ارسطو اور ہر یقلیتس، جیسے مشہور فلاسفہ کو عقلیت پسند قرار دیا ہے۔ سب سے بڑے فلسفی افلاطون کو ان کا امام قرار دیا ہے۔ (روایات فلسفہ) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے مطابق حسیت پسندوں (Empricison) کا دعویٰ ہے کہ حواس ہی ذریعہ علم ہیں، فکر نہیں۔ علم صرف وقوف بالحواس تک محدود ہے۔ یعنی محسوس ہی حقیقت ہے۔ لہٰذا موجود فی الخارج حقیقت ہے۔ ذہنی حقیقت نہیں۔ مرکب حقیقت ہے۔ بسیط حقیقت نہیں، زمانی و مکانی یعنی حادث حقیقی ہے، قدیم یعنی ورائے زمان و مکاں حقیقت نہیں۔ ممکن حقیقت ہے، واجب حقیقی نہیں۔ دوسری طرف عقلیت پسند (Rationalists) کہتے ہیں کہ حواس سے کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔ جو تصورات اس سے حاصل ہوتے

ہیں وہ مبہم (Obscure) اور ژولیدہ فکر (Confused Thoughts) ہوتے ہیں صرف عقل یا فکر سے حقیقت منکشف ہوتی ہے اور عقل من حیث الکل کا انکشاف کرتی ہے۔ لہذا ذہنی حقیقی ہے اور موجود فی الخارج غیر حقیقی ہے۔ کلی حقیقت ہے اور جزوی غیر حقیقی ہے۔ بسیط حقیقی ہے اور مرکب غیر حقیقی ہے۔ مطلق حقیقت ہے اور اضافی حقیقت نہیں۔ قدیم حقیقی اور حادث غیر حقیقی ہے۔ واجب حقیقی اور ممکن غیر حقیقی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک فلسفہ ایک ایسی قدر ہے جو ارتقاء پذیر ہے اس کی منطقی تدریج کے یہی تین مدارج ہیں یعنی حسیت، عقلیت اور کانٹ کا فلسفہ تنقید۔ (ملخص از قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل)

فلاسفہ کے درمیان بحث و مباحثہ ابھی جاری تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں قرآن مجید نے حقیقت کو یوں اجاگر کیا۔ (تم خود اپنی حالت پر غور کیوں نہیں کرتے کہ تمہیں اپنی توانائیوں کی تکمیل کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے)۔ تم شکم مادر سے دنیا میں آتے ہو تو اس طرح کہ تمہیں کسی بات کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں سمع و بصر (ذرائع معلومات اور پھر ان معلومات کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کا ملکہ قلب (Mind) عطا کرتا ہے تا کہ تم بتدریج اپنی ممکنات (Potentialaties) کو مشہود (Actualise) کر سکو'' 67/23, 16/18 یعنی علم کے لیے حواس و عقل دونوں ضروری ہیں۔ قرآن پاک کے اس واضح تصور کے باوجود یہ تنازعہ جاری رہا۔ آخر قرآن کے اس فیصلے نے قرآن کی دیگر تعلیمات کی طرح اپنے آپ کو دنیا سے منوالیا۔ وہ یوں کہ کانٹ نے اپنے تنقیدی فلسفہ کے تحت پہلی بار علم کو حواس اور عقل دونوں کا نتیجہ قرار دیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر برہان احمد لکھتے ہیں۔ ''انسان چونکہ زیادہ دیر تک تشکیک میں مبتلا نہیں رہ سکتا اس لیے مغرب میں کانٹ (Kant) نے تنقیدی فلسفہ کی بنا رکھی اور طے کیا کہ علم محض عقل سے حاصل نہیں ہوتا ہے اور نہ محض حواس سے بلکہ علم قضیۂ مرکبہ وہبیہ کا نام ہے''۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر انعام الحق نے اپنی تصنیف ''نظریہ خیر'' میں خود کانٹ کی عبارت کا ایک اقتباس دیا ہے کانٹ کے مطابق۔

" Thoughts without content are empty, Perceptions without conceptions are blind .. understanding can percive nothing, The senses can think nothing, knowledge arises only from their united actions".

علامہ اقبال نے اپنے پہلے خطبے میں کانٹ کے بارے میں فرمایا ہے ''کانٹ ہی کی ذات وہ سب سے بڑا عطیہ ہے جو جرمنی کو عطا کیا گیا''۔

اب انسان کے پاس حصول علم کا ایک ذریعہ یہ ہے اور دوسرا ذریعہ علم وحی جو ختم نبوت کے بعد قرآن پاک میں محفوظ ہے۔ اس طویل جنگ میں ڈیکارٹ نے دونوں نظریات کی ترجمانی کی لیکن کانٹ سے پہلے کسی نے تیسرا تصور نہیں دیا۔

عصر حاضر میں اثری انکشافات (Archealogical Discoveries) نے بھی بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس بارے میں علامہ پرویزؒ نے ایک اہم حقیقت کا یوں انکشاف کیا ہے۔ ''اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کا علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تو وہ ہے جسے تاریخی نوشتے۔ یعنی تاریخ کے تحریری ریکارڈ کہا جاتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کا ایک اور بھی طریقہ ہے جسے اثری انکشافات کہا جاتا ہے۔ دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ یہ عظیم المرتبت علمی کارنامہ عصر حاضر کی ایجاد ہے۔ لیکن جس کی نظریں قرآن مجید پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اولیت کا سہرا بھی اسی سرچشمہ علم خداوندی کے سر پر ہے۔ قرآن کے اوراق الٹیے اور دیکھئے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان مخالفین سے کہو کہ تم مختلف ممالک میں چلو پھرو۔۔۔۔۔ اور گزشتہ اقوام کے کھنڈرات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان کی ٹھیکریوں پر عبرت و موعظت کی کتنی اثر انگیز داستانیں منقوش ہیں۔۔۔ سنت اللہ کی طرح سیروفی الارض کی آیات بھی قرآن مجید میں بکثرت آئی ہیں''۔ (مطالب الفرقان جلد دوئم)۔

اثری انکشافات یعنی سیروفی الارض کے ضمن میں قرآن کریم نے کائنات اور زندگی کی تخلیق پر غور وفکر نیز تحقیق و تفتیش کا حکم دیا ہے۔ فرمایا۔ ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح ایک چیز کی تخلیق کی ابتداء کرتا ہے۔ پھر کس طرح اسے مختلف گردشیں دے کر ارتقائی منازل طے کراتا ہوا آگے لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی رو سے نہایت آسانی سے ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اے نبی ﷺ کہہ دو کہ ذرا دنیا میں چل پھر کر دیکھو کہ خلق کی ابتداء کیسے ہوئی اور پھر کس طرح نئی نئی زندگیاں ابھرتی چلی گئیں۔ اس طرح وہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یہ سب کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے''۔ 29/19-20

تخلیقی پروگرام کیلئے اللہ کے یہاں دو عالم ہیں یعنی عالم امر اور عالم خلق۔ خلق کی ابتداء سے پہلے جب کوئی شے تدبیری مراحل میں

ہوتی ہے۔تو یہی تدبیری مرحلہ عالم امر سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ کیا ہے اور کس طرح متشکل ہوتا ہے؟ اس کے متعلق انسان کچھ بھی نہیں جان سکتا۔ کیونکہ انسانی علم صرف عالم محسوسات تک محدود ہے اور یہ امور محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ عالم امر کے حالات و واقعات سرحد ادراک انسانی سے ماوراہیں۔ اسی لیے انسان کو عالم خلق میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس کا علم انسان حاصل کرسکتا ہے اور حاصل کر بھی رہا ہے۔

بنی نوع انسانی کے معاشی اور معاشرتی عروج وزوال کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کائنات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کائناتی قوتوں کے متعلق ان کا ردعمل کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالودود مرحوم کے مطابق قرآن کا ایک بڑا حصہ (تقریباً 1/8) کائنات کے متعلق ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن سائنس کی کتاب ہے۔ بلکہ ہر آیت مظاہر فطرت کو کسی بہت بڑی حقیقت کے لیے بطور شہادت پیش کرتی ہے۔تمام کائنات قوانین فطرت کی گرفت میں ہے۔ان قوانین کو انسان سمجھ سکتا ہے اس لیے کائنات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عقل و دلائل کیلئے ناگزیر نہ ہو۔

نظریہ اضافیت کے خالق البرٹ آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں اپنے تعجب کا اظہار یوں کیا تھا۔

"The most incomprihensible thing about the universe is that it is comprihensible"(Grand Design)

سٹیفن ہاکنگ کے مطابق ''کائنات کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی بنیادی فزکس (Physics) سادہ ہے لیکن اس کی کیمسٹری بڑی پیچیدہ ہے''۔کائنات کے بارے میں وہ یہ بھی کہتا ہے

"We see the universe the way it is, because we exist (Grand Design)

یعنی انسان جیسی شعوری مخلوق ایسی ہی کائنات میں موجود ہوسکتی ہے۔ایک اور سائنسدان پال ڈیویز کا کہنا ہے کہ'' کائنات اتنی سادہ بھی نہیں اس کے اندر ایک لطیف سی پیچیدگی موجود ہے''۔(Mind of God) کائنات کیسی بھی ہو، تاریخ شاہد ہے کہ انسان ابتداء ہی سے اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق اس پر غور وفکر کرتا رہا ہے۔شروع شروع میں کائنات کی حقیقت پر سحر وطلسم، اوہام پرستی، جادوٹونہ اور جہالت وخرافات کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔

خوف کی وجہ سے اجرام فلکی کی پرستش ہوتی تھی۔ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے ان عجوبات کو وہ دیوی دیوتا سمجھ کر ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا تھا۔ آخر کار انسانی علم کی ترقی اور علم وحی کے پیش کردہ حقائق کی روشنی کے باعث توہم پرستی اور جہالت آفرینیوں کے یہ بادل چھٹنے لگے اور مظاہر فطرت کی کنہ وحقیقت بھی بے نقاب ہوتی چلی گئی۔ قدیم بابل اور مصر سے علم وحکمت کے چشمے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ سید علی عباس کے مطابق جب ان ممالک کے تمدن رو بہ زوال ہو گئے تھے تو وہاں کے پروہتوں نے اپنے معبدوں میں علم دفن کی شمع روشن رکھی۔ یہ لوگ اپنے معبدوں کی چھتوں پر بیٹھ کر رات کے وقت ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ لوگ سورج گرہن اور چاند گرہن کی پیش گوئیاں کرنے پر قادر تھے اور ان پیش گوئیوں سے وہ عوام کو خوف زدہ کر کے مفاد اٹھاتے تھے۔ ایشائے کوچک میں بحیرہ روم کے ساحل پر آؤنا (Inonia) نام کی ایک شہری ریاست تھی۔ یہاں کے طلباء بابل ومصر کا سفر کر کے اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ اس شہر میں فیثا غورث نے پہلی بار ریاضی کے اصول مرتب کیے۔ اور اسی ریاست کے ایک سائنسدان طالیس (624-550ق م) نے اوہام وخرافات کے آہنی پردوں کو چاک کر کے کائنات کی پہلی دفعہ خالص سائنسی تشریح کی۔ اس نے کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے۔ بعد میں ایشائے کوچک پر ایرانیوں کے قبضے کے نتیجہ میں آٹونی شہری خوف زدہ ہو کر اپنی سائنس اور فلسفے کو لے کر یونان چلے گئے وہاں انکی تدریس سے جس فلسفہ نے جنم لیا اسے ''یونانی فلسفہ'' کہا جاتا ہے۔

ابتدائی دور کے یونانی فلاسفہ میں ہیریقلتس ایک بڑا نام ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کائنات پانی سے نہیں بلکہ آگ سے بنی ہے۔ اور یہ بھی کہ کائنات کو کسی دیوتا نے نہیں بنایا۔ اس کا ایک اہم عقیدہ یہ بھی تھا کہ واقعات ہی کائنات کے اساسی اصول ہیں۔ یوں یہ موجودہ لاادری فلسفی برٹرینڈ رسل کا پیش رو ہے کیونکہ رسل بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ ہیریقلتس کا ایک اور معرکہ آراء نظریہ یہ تھا کہ ہر شے اپنے بطون میں اپنی ضد رکھتی ہے۔ اضداد کے یہ تصورات ہیگل کے واسطے سے فلسفہ جدلی مادیت کے اساسی افکار بن چکے ہیں۔ ایپکورس کا کہنا تھا کہ مادی عالم سراسر میکانکی ہے جس میں قدرتی اسباب کارفرما ہیں وہ انسان کو خود مختار سمجھتا تھا۔ ایک اور فلسفی دیما قریطس مذہب کا مخالف تھا اور مادی کائنات کا قائل تھا۔ انا کسی مینڈر کا کہنا تھا کہ ذی حیات مخلوق نم آلود عنصر سے پیدا ہوئی ہے۔ ابتداء میں انسان بھی

جانوروں یعنی مچھلی کی طرح تھا یعنی وہ حیوانی ارتقاء کا قائل ہونے کی وجہ سے ڈارون کا پیش رو ٹھہرتا ہے۔ زینوفینیس نے عالم کو ہی خدا قرار دیا ہے جس کو بعد میں ابن عربی نے وحدت الوجود کی صورت میں پیش کیا۔ اس کے بعد سوفسطائیوں کا زمانہ آیا انہوں نے علم وفن کا رخ کائنات کی بجائے انسان کی طرف پھیر دیا۔ پال ڈیولیز کے مطابق ''ان کا خیال تھا کہ انسان کو نیچر کے حوالے سے سمجھنے کی بجائے نیچر کو انسان کے حوالے سے سمجھا جانا چاہیے۔ لہذا انہوں نے کونیات اور الٰہیات کی جگہ منطق، سیاست، بلاغت، خطابت، لغات اور شاعری کی تدریس پر زور دیا۔'' (Mind of God)

ان کے بعد رواقیہ کا دور آیا۔ مشہور فلسفی زینو الیاطی ان کا امام تھا۔ رواقیہ کا خیال تھا کہ عالم کو کسی نے نہیں بنایا اور نہ ہی کسی شخصی خدا نے تخلیق کیا۔ خدا کے بغیر کسی کا وجود ممکن ہی نہیں اس طرح یہ بھی وحدت الوجودی تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ خدا عقل مطلق ہے اور عقل آفاقی قانون ہے۔ اس لیے عالم پر آفاقی قانون کی حکمرانی ہے۔ اس لحاظ سے انہیں موجودہ دور کے سائنسدان سٹفین ہاکنگ کا پیش رو کہنا چاہیے جو خدا کو قانون کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ پہلے تو سوال اٹھاتا ہے کہ قانون کی بنیاد (Origin) کیا ہے؟ اس کے جواب میں لکھتا ہے۔

"The answer of Kepler, Galileo, Descartes and Newton was that the laws were the word of God. However, this is not more than a definition of God as an embodyment of the laws of nature". (Ground Design)

میرے خیال میں سٹیفن نے جس طرح ان بڑے سائنسدانوں کے جواب کی تشریح کی ہے وہ ان کے جواب کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی۔

قدیم یونانی مادہ پرست حکماء، سوفسطاء، اور رواقیہ کے بعد "Post Socrates Era" کی ابتداء ہوتی ہے۔ جس میں سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے مشہور زمانہ فلاسفہ شامل ہیں۔ انہوں نے جس فلسفے کی بنیاد رکھی اس نے صدیوں تک دنیا پر حکمرانی کی۔ سقراط افلاطون کا استاد تھا۔ سقراط نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی اس کے فلسفہ کو افلاطون نے ہی بیان کیا ہے۔ رسل کے مطابق اس دور کے فلاسفہ کا ذہن قیاسی تھا۔ استقرائی نہیں تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے مشاہدے اور تجربے سے کام لینے کی بجائے سائنس کو منطق کے تحت

کر کے کائنات کے مشاہدے اور آفاقی مسائل کی جگہ انہی علوم کی تدوین کی جن کا براہ راست تعلق انسانی ذات سے تھا۔ افلاطون نے تو اس عالم مادی کو سرے سے ہی غیر حقیقی قرار دے دیا اور اسے ''عالم امثال'' کا سایہ ٹھہرایا۔ افلاطون نے ان امثال کا ایک ایسا عالم بسایا ہے جو مادی دنیا سے ماورا ہے اور بے شمار امثال پر مشتمل ہے۔ اس مادی عالم میں جتنی اشیاء دکھائی دیتی ہیں وہ انہی امثال کے عکس و سائے ہیں۔ اسی لیے اسے وجودی تصوف کا امام کہا جاتا ہے۔ تاہم اس کے شاگرد ارسطو نے ہیئت (Form) اور مادے کی دوئی میں ایک حد تک قدما کی مادہ پرستی کو برقرار رکھا۔ اس نے اپنے استاد کی مثالیت پسندی کو ایک حد تک ہی قبول کیا ہے وہ کہتا ہے ''مجھے اپنا استاد اور حق وصداقت دونوں عزیز ہیں لیکن صداقت زیادہ عزیز ہے''۔ اس نے اپنے استاد کے عالم امثال پر تنقید بھی کی ہے۔ ارسطو نے زمین کو مرکز میں رکھ کر ایک سکونی (Static) کائنات کا تصور دیا ہے جس پر بعد میں ایک اور سائنسدان نے سکندریہ میں مزید کام کر کے کائنات کا ایک ماڈل تیار کیا تھا اس کا نام ٹالمی (Trolmy) تھا اس لیے اس ماڈل کو ارسطو/ ٹالمی) ماڈل کہا جاتا ہے۔ اس ماڈل کے مطابق سورج، چاند، مرکری، وینس، مریخ، جیوپیٹر اور سیٹران اپنے مداروں میں زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ اس وقت تک یہی پانچ سیارے (زمین کے علاوہ) دریافت ہوئے تھے۔ بعد میں ان کی تعداد نو تک پہنچ گئی تھی لیکن 2006ء میں پلاٹو کو نظام شمسی کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اب ان سیاروں کی تعداد آٹھ ہے۔ بعد میں عیسائی کیتھولک چرچ نے بھی اس ماڈل کو تسلیم کر لیا تھا جس سے بعد میں بڑی خرابی پیدا ہوئی اور سائنس اور مذہب کے درمیان اختلاف ہی نہیں سخت دشمنی پیدا ہو گئی جو اب تک جاری ہے۔ بہر حال اس طرح اس زمین مرکز Geocentric ماڈل کی تقریباً 1500 سال تک حکمرانی رہی۔ حالانکہ قرآن مجید سکونی کائنات کی تردید کر چکا تھا۔ 21/33, 36/90

ارسطو/ ٹالمی ماڈل کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب 1514ء میں پولینڈ کے ایک پادری کوپرنیکس نے ایک گمنام شخص کی حیثیت سے سورج مرکز (Helliocentric) کا ایک ماڈل پیش کیا۔ اس کے مطابق زمین اور دیگر سیارے ساکن سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ کوپرنیکس کی یہ کتاب اسے بستر مرگ پر ملی۔ درحقیقت کوپرنیکس یہ ماڈل پیش کرنے والا پہلا شخص نہیں تھا بلکہ اس سے صدیوں پہلے یونانی فلسفی ارسطاکس یہ نظریہ پیش کر چکا تھا لیکن ارسطو نے اسے رد کر دیا تھا۔ کوپرنیکس کے اس ماڈل کو تقریباً سو سال تک اہمیت نہیں دی

گئی کیونکہ چرچ اس کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آخر اٹلی کے گلیلیو اور جرمنی کے جوہانز کیپلر نے اس فارمولے کو تسلیم کر کے اس پر مزید تحقیق بھی کی جس کے نتیجہ میں 1687ء میں نیوٹن کی شہرہ آفاق کتاب (Philosophia Naturalis Principia Mathematica) شائع ہوگئی۔ لیکن اس کوشش میں ان سائنسدانوں کو چرچ کی طرف سے نہ صرف سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ان کو اذیتیں بھی دی گئیں۔ 1600ء میں برونو کو پھانسی دی گئی۔ گلیلیو پر مقدمہ چلا اور اسکو سزا ہوئی۔ کیپلر کی ماں کو چڑیل قرار دے کر قید کر دیا گیا جس کی وجہ سے کیپلر کا سارا وقت اپنی ماں کو سزا کے بغیر رہا کرانے میں صرف ہوا۔ اسحاق نیوٹن نے اپنی کتاب میں کشش ثقل اور اصول حرکت پر ایک ماڈل مرتب کیا جس میں زمین کی جگہ سورج کو مرکزی حیثیت دی گئی۔ جسے پوری دنیا نے تسلیم کر لیا اور ارسطو/ ٹالمی ماڈل ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ البتہ ساکن (Static) کائنات اور مطلق وقت کا تصور باقی رہا۔ 1781ء میں کانٹ نے بھی Thesis اور Antithesis کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ دونوں تصورات اس کے اس پوشیدہ خیال پر مشتمل تھے کہ کائنات رہے یا نہ رہے وقت جاری رہے گا۔ سائنس کے جدید تصورات کی تشکیل میں نیوٹن کے پیش کردہ قوانین کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ایک مشہور رومانی شاعر الیگزینڈر پوپ نے کہا تھا (Nature and Nature's laws lay hide in night. God said , let Newton be! and all was light)

یعنی قدرت اور قوانین قدرت رات کی تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ خدا نے کہا نیوٹن! اور نور ہی نور ہوگیا۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ یورپ میں یہ علمی روشنی (نور) آئی کہاں سے؟ یہ ایک طویل موضوع ہے جو الگ مضمون کا متقاضی ہے یہاں پر صرف چند اشاروں سے بات کی جائے گی۔ اس سوال کے جواب میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور مورخ، دانشور، مفکرین اور فلسفی متفق ہیں کہ علم کی یہ روشنی مسلمانوں کی وساطت سے یورپ میں پہنچی ہے۔ ان میں رابرٹ بریفالٹ، ڈاکٹر ڈریپر، ڈاکٹر پکتھال، پرفیسر آرنلڈ، ڈاکٹر گبن، پروفیسر براؤن، موسیو لیبان اور موجودہ برطانوی پرنس چارلس جیسے مفکر اور مدبر لوگ شامل ہیں۔ پروفیسر جے برونوسکی اپنی کتاب عروج آدم (Ascent of man) میں لکھتا ہے ''730ء تک اسلامی سلطنت، سپین، افریقہ سے لیکر چین و ہندوستان تک پہنچ گئی۔ ایک باوقار اور طاقت ور سلطنت۔ جبکہ یوروپ ابھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا''۔ (صفحہ 77) نیز یہ

کہ ''محمد ﷺ اس پر سختی سے قائم تھے کہ اسلام معجزوں کا مذہب نہیں ہوگا۔ یہ دانشورانہ روح ایک نئی فکر اور تجزیے کا نمونہ ہوگئی''۔ (ایضاً)

علامہ اقبال بھی اس بارے میں راجر بیکن کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں ان کے اپنے الفاظ ''لیکن سوال یہ ہے کہ راجر بیکن نے علم وحکمت کا درس لیا تو کہاں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اندلس کی اسلامی درس گاہوں سے''۔ (خطبات صفحہ 196)۔ اپنے اس موقف میں انہوں نے بریفالٹ کی کتاب ''تشکیل انسانیت'' کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں بریفالٹ کے مطابق راجر بیکن ''یہ اعلان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکا کہ اگر اس کے معاصرین کو سچ مچ علم کی تلاش ہے تو انہیں چاہیے کہ عربی زبان سیکھیں''۔ (ایضاً)۔ علامہ پرویز نے بھی اس موضوع پر بہت لکھا ہے اور ان کی معرکہ آرا کتاب ''انسان نے کیا سوچا'' اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ علی عباس جلالپوری نے بھی اس پر لکھا ہے۔ ان کے مطابق جب یوروپ میں علم کی تحصیل راہبوں اور پادریوں تک محدود تھی اور یہ علم بھی تحقیقی علم نہیں تھا بلکہ اولیاء اور اصفیاء کے فسانہ ہائے کرامات پر مبنی تھا۔ ان تاریک صدیوں میں مسلمانوں نے ہسپانیہ، صقلیہ، بغداد اور دمشق میں علم کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے بھی اس موضوع پر ایک تحقیقی اور معلوماتی کتاب ''یوروپ پر اسلام کے احسانات'' کے نام سے شائع کی تھی۔

پروفیسر جے برونو مسکی نے لکھا ہے کہ آئن سٹائن کی کائناتی تصویر نیوٹن کی تصویر سے مختلف تھی۔ نیوٹن کا نظریہ ایسا تھا جیسے خدا دنیا کو دیکھتا ہے یہ ہر دیکھنے والے کو ایک جیسی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس آئن سٹائن کا نظریہ ایک انسان کی نظر سے دیکھا جانے والا منظر ہے جس میں ہر دیکھنے والے کی نسبت سے یہ منظر بدل جاتا ہے۔ کائنات کا موجودہ ماڈل زیادہ تر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر مبنی ہے۔ اس نظریے نے کائنات کے بارے میں انسان کے گزشتہ ڈھائی ہزار سال کے تصورات کو یکسر بدل دیا ہے۔ ٹھوس مادے اور مطلق وقت کے تصورات بدل گئے۔ وقت کو خلا میں شامل کر کے چار ابعادی (Four Dimensional)، Space Time کی اصطلاح متعارف کرائی۔ نیوٹن ماڈل میں ایسا منظر جس میں حالات واقعات رونما ہوتے رہتے تھے مگر وقت اور خلا ایک دوسرے سے آزاد ان واقعات سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ لیکن نظریہ اضافیت کے تحت Time Space ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی وقت اور خلا نہ کائنات سے الگ ہیں اور نہ ایک دوسرے سے آزاد۔ خلا کو وقت کے بغیر Curved تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے سٹیفن

کے نزدیک وقت کی بھی ایک shape ہے۔موجودہ زمانے میں وقت کے بہاؤ سے متعلقہ تمام جدید مباحث آئن سٹائن کے نظریہ پر رکھے جاتے ہیں۔اس کے اصول مساوات (E = mc2) نے وقت اور خلا کو حرکی حیثیت دی ہے یعنی انہیں خاموش پس منظر سے نکال کر کائنات کی حرکی (Dynamic) دنیا میں ایک اہم شراکت دار کی حیثیت دی۔علامہ اقبال نے وقت کے اس تصور کو تسلیم نہیں کیا۔وہ کہتے ہیں ''اندریں صورت میں یہ سمجھتا ہوں کہ زمانے کو بُعد رابع ٹھہرانا گویا اسکی نفی کرنا ہے'' (خطبات صفحہ 83)۔

آئن سٹائن کی جنرل تھیوری کے مطابق کائنات کو یا تو پھیلنا چاہیے یا سکڑنا چاہیے۔مگر آئن سٹائن کے نزدیک ساکن کائنات (Static Universe) کا تصور قطعی طور پر غیر متبدل تھا کہ اس کی خاطر اپنی تھیوری تبدیل کر کے اس میں کاسمالوجیکل ری پلشن (Cosmplogical Repulsion) جیسی پراسرار اصطلاح شامل کر لی لیکن جب ایڈون ھبل نے 1929ء میں ثابت کر دیا کہ کائنات پھیل رہی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا

"It was the biggest blunder of my life"

یہ تھا کائنات کے بارے میں انسانی غور وفکر، تحقیقات اور کاوشوں کا مختصر احوال، کائنات کی طرح اس کا علم بھی وسیع ہے اس لیے اس علم کی تلاش جاری رہے گی بلکہ اس میں تیزی بھی آئے گی۔قرآن مجید کی ایک پیش گوئی ہے یعنی ''ہم لوگوں پر خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی (نفسیاتی) زندگی میں ایسے ایسے پوشیدہ حقائق بتدریج بے نقاب کرتے جائیں گے تا کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ قرآن مجید کے تمام دعاوی حقیقت پر مبنی ہیں یونہی محض ظن وگماں نہیں''۔41/53۔ یہ انکشافات خود انسان کی کاوشوں سے ہو رہے ہیں ہر نئی دریافت یا تصور قرآن مجید کی صداقت کی شہادت بن جاتا ہے۔اب تو Quantum Physics اور Uncertainty Principal جیسے نظریات سے نئی اور انوکھی باتیں سامنے آرہی ہیں۔یعنی Imaginary ،Multi Universe Idea Quantum Fluctuation ،M.TheoryTime, Black Holes, Worm Holes, String ascillation, Quantum ExtangIment, Quantum Non Locality, Quantum Leap Singularity جیسی درجنوں اہم اصطلاحات کائنات میں

پوشیدہ حقائق کی دریافت میں نہ صرف اضافے کا باعث بن رہی ہیں بلکہ ان کی اہمیت بھی اجاگر کر رہی ہیں۔ ابھی 4 جولائی 2012ء کو "CERN" کے سائنسدانوں نے جس اہم پارٹیکل کی دریافت کا اعلان کیا ہے۔ وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس پارٹیکل کی بڑی اہمیت ہے جس سے کائنات کو سمجھنے میں تیزی سے پیش قدمی ہوگی اور شاید Grand Unified Theory کی تشکیل میں بھی کوئی کردار ادا کرے۔ لیکن اس نئی دریافت پر مزید بات کرنے سے پہلے ماضی میں ہونے والی چند دریافتوں کا ذکر مناسب رہے گا جو قرآن مجید کی صداقت اور حقانیت کی شہادت دیتی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت یعنی نزول قرآن کے وقت ''نظریہ امثال'' کے تحت کائنات کو حقیقت نہیں بلکہ محض خواب و خیال سمجھا جاتا تھا۔ ہندی ویدانت اور نوافلاطونیت کے تصورات نے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی تھی۔ قرآن مجید نے اس نظریے کو سختی سے رد کرتے ہوئے اعلان کیا۔ ''اللہ نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے اور اس سے ان لوگوں کیلئے حقیقت تک پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جو وحی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ 30/8, 29/44۔ آج دنیا میں اس مادی کائنات کو بالکل حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ صرف وحدت الوجود کے نظریہ کے قائل شاید ایسا نہ سمجھتے ہوں۔

کائنات کے بارے میں ایک اور تصور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے کہ اس کا کوئی مقصد یا غایت نہیں اور نہ ہی اسکی تخلیق میں کسی شعوری قوت کا کوئی کردار ہے۔ یعنی اسکا کوئی خالق نہیں۔ یہ محض ہنگامی یا اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے۔ اس لیے کسی مقصد یا منزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کی تخلیق کو بھی بے مقصد سمجھا جاتا تھا جسکی کوئی منزل نہیں۔ قرآن مجید نے کائنات کو بامقصد قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ''خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے (یونہی بے کار اور تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے نہیں کیا مقصد اس کا یہ ہے) کہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ برآمد ہو جائے اور کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔ 45/22۔ یعنی کائنات کا ایک مقصد نتائج کا مرتب کرنا ہے۔ اس کی تشریح ڈاکٹر برہان احمد نے یوں کی ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک ہی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور بعثت بھی اسی مقصد کے لیے ہوئی ہے پھر نزول قرآن کی بھی یہی غایت ہے کہ بعثت کا مقصد پورا ہو۔ اس کائنات کی اپنی بناوٹ اور ساخت کا سازگار ہونا تبھی ممکن ہے جب ہم اس نصب العین کو جس کا تقاضا ہماری فطرت میں ہے، قرآن مجید کی ہدایت سے حاصل کریں۔ اس

مقصود کو حاصل کرنے میں ہمارا کمال مضمر ہو اس کے لیے ہم صرف اس صورت میں جدوجہد کر سکتے ہیں جب جدوجہد سے پہلے ہمیں اس کے حاصل ہونے کا یقین ہو۔ یعنی ہمیں معلوم ہو کہ کائناتی سطح پر کوئی قانون ہے جو نتائج متعین کر رہا ہے۔ یہ کائناتی قانون قرآن مجید کی زبان میں ربوبیت کا قانون ہے اور سائنس کی زبان میں ارتقاء یا نشوونما کا قانون ہے اور ارتقاء کا نام یہ ہے کہ ہر وجود نامی بتدریج اپنے مقصد کے قریب ہو جائے (قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل)۔

علامہ پرویزؒ نے اس کی یوں وضاحت کی ہے ''تخلیق کائنات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانون مکافات عمل بروئے کار آجائے یہ کس طرح ہوتا ہے ہمیں اس کا علم نہیں لیکن جو قوم تخلیق کائنات کی اس غرض و غائیت پر ایمان رکھے۔ وہ خدا کے قانون مکافات عمل پر پورے حتم و یقین کے ساتھ ایمان رکھے گی اور یہی وہ قوم ہوگی جو فطرت کی قوتوں کو فساد و خون ریزیوں کا موجب بنانے کے بجائے انہیں عالم گیر انسانیت کی ربوبیت کا ذریعہ بنائے گی۔ (مطالب الفرقان جلد دوئم)۔ اب مغربی مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کائنات اور انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ پال ڈیویز اپنی کتاب میں لکھتا ہے'' مجھے اس امر کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کہ اس کائنات میں ہمارا وجود محض اتفاقاً لگ جانے والا تکا ہے۔ نہ ہی یہ کہ کائنات کی تاریخ میں حادثے کے طور پر کھل جانے والا باب ہے۔ ہم کائنات میں جاری و ساری عمل میں عمیق طور پر ملوث ہیں'' (Mind of God) یہی مصنف ماہر فلکیات بریڈ ہائل کے بارے میں لکھتا ہے کہ'' وہ خالص مذہبی اور روحانی واقعات کا قائل تھا وہ سمجھتا تھا کہ کائنات کی تنظیم کسی ارفع ترین ذات کے ہاتھ میں ہے اور وہ عالم کو لا انتہا مستقبل کی طرف لے جا رہا ہے''۔ (ایضاً)۔ یہی بریڈ ہائل بگ بینگ کی اصطلاح کا خالق ہے جو اس نے 1949ء میں پیش کی تھی۔ مغربی مفکرین کے اس بارے میں خیالات و نظریات جاننے کیلئے ''انسان نے کیا سوچا'' جو پرویز صاحب کی تصنیف ہے کا مطالعہ مفید رہے گا۔

یونان کے دیگر فلاسفہ کی طرح ارسطو کا بھی خیال تھا کہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن قرآن مجید کے مطابق یہ تخلیق کی گئی ہے جسکی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی ۔ بگ بینگ کے نظریے نے ان کے نظریے کو رد کر دیا ہے۔ ہر چند کہ سٹیفن ہاکنگ Imaginary Time کی اصطلاح استعمال کر کے اس کی تشریح مختلف انداز سے کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ

Microwave Background Radiation کی دریافت نے (جو 1965ء میں دو امریکی سائنسدانوں نے کی تھی) بگ بینگ نظریے کو ثابت کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے کائنات کی ابتدائی تخلیق کی طرف کچھ اشارے کئے ہیں مثلاً کہ ابتداء میں دھواں تھا۔ 41/11 یا کہ اس وقت زمین و آسمان ایک ہیولا (Nebula) تھے 21/30

زمین کے بارے میں ہے کہ بعد میں ہم نے اسکو گوپے کی طرح پھینک دیا۔ 79/30۔ یہ اور اس طرح کی تمام حالتیں بگ بینگ کے وقت رونما ہوئیں۔ قرآن پاک کے مطابق کائنات میں نئے نئے اضافے بھی ہو رہے ہیں۔ 35/1۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ''اس کی ترکیب بھی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔ یہ کوئی جامد کائنات نہیں نہ ایک مصنوع ہے جسکی تکمیل ختم ہو چکی ہے اور بے حرکت اور نا قابل تغیر و تبدل ہے۔ برعکس اس کے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے''۔ (خطبات صفحہ 47) کائنات پھیل بھی رہی ہے 51/47۔ اب ان حقائق کو سائنس بھی تسلیم کر رہی ہے۔ 1952ء میں بریڈ ہائل نے دیگر سائنسدانوں کے ساتھ مل کر Steady State کا نظریہ پیش کیا تھا جسکے مطابق کائنات مسلسل پھیل بھی رہی ہے اور اس میں نئے مادے کی تخلیق بھی ہو رہی ہے۔ 1929 میں Edvin Hubble نے فلکیات کے بارے میں اپنے مشاہدات کو قلمبند کر کے یہ معرکہ آرا نظریہ پیش کیا تھا کہ کائنات پھیل رہی ہے بعد میں اسی نظریے کی وجہ سے کہکشاں اور Big Bang جیسے اہم تصورات نے جنم لیا۔ قرآن کے مطابق ''زمین اور انسان کی داخلی زندگی میں بہت سی نشانیاں ہیں تو کیا تم علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے'' 51/20-21۔ لہذا جس قدر انسان کائنات پر غور و تدبر، تحقیق و تفتیش کرتا جائے گا اسی قدر کائنات کے بے شمار پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور ساتھ ہی اللہ کی لامحدود قوت اور علم کا ادراک ہوتا جائے گا۔

آخر میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کائنات پر تحقیق کے متعلق اتنا زور دیتا ہے تو آج مسلمان سائنس سے بے بہرہ کیوں ہیں؟ ڈاکٹر وڈود اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔ ''حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآنی ہدایت سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ جب تک مسلمان قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے رہے وہ سائنسی علوم کے موجد و سرخیل تھے۔ اس کے بعد جس قدر وہ قرآن سے دور ہوتے گئے اسی قدر گراوٹ اور پسماندگی ان کی زندگی کا جزو بنتی گئی''۔ (مظاہر فطرت اور قرآن) مسلمانوں کے قرآن سے دور ہونے کی بہت سی

وجوہات ہیں۔لیکن علامہ اقبال نے اس کی ایک بنیادی اور اہم وجہ بتائی ہے۔علامہ کے نزدیک ''یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان میں غور و تفکر کرے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی۔ جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے اور متناہی ہے اور اضافہ پذیر، تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتداء میں انہوں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا تھا اتر آئے۔شروع شروع میں تو انہیں اس امر کا احساس ہی نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفہ یونانی کے منافی ہے اور اس لیے حکمت یونان پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا۔لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر لہذا ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہیں۔اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی۔حتیٰ کہ تہذیب جدید کے بعض پہلوؤں کو دیکھئے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت ہے''۔آگے چل کر مزید فرماتے ہیں ''بریفالٹ کہتا ہے کہ یونانیوں کو درحقیقت نظریوں سے دلچسپی تھی۔حقائق سے نہیں تھی۔لہذا ان کے افکار ایک روک تھے جس نے مسلمانوں کو کوئی دوسو سال تک یہ سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ قرآن کی حقیقی روح کیا ہے۔

(خطبات صفحہ 195,198

جہاں تک 4 جولائی 2012ء کی دریافت کا تعلق ہے تو اس کا پس منظر مختصر الفاظ میں کچھ یوں ہے کہ 1964ء میں مسٹر پیٹر ھگ نے اپنی تحقیقات کے تحت اس پارٹیکل کو تجویز کیا تھا اور اسکی کمیت اور دیگر خصوصیات (Properties) کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔ ھگ کی اس تجویز کے بعد سائنسدان ایسی نادیدہ قوت کی تلاش میں تھے جسکی وجہ سے دیگر پارٹیکل اپنی کمیت (Mass) حاصل کرتے ہیں۔ھگ بوزان کی دریافت اس لیے اہم ہے کہ یہ اس فیلڈ کو ثابت کر دے گا جس کی قوت خلا میں ہر جگہ Non Zero ہے اور اسی ھگ فیلڈ کے ساتھ ردعمل کے نتیجے میں بنیادی پارٹیکل کمیت حاصل کرتے ہیں۔

ھگ کے نام پر اس ذرے کا نام ھگس بوزان رکھا گیا تھا۔یہ ایسا بوزان ہے جس کے باعث اس جیسے اور بہت سے پارٹیکل ایک

ہی جگہ اور ایک ہی Quantum State میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس بوزان کا کوئی Spin Electric Charge یا Colour Charge نہیں یہ ذرہ غیر متوازن ہے اور فوراً ہی دوسرے پارٹیکلز میں Decay کر جاتا ہے۔ اس بوزان کی کمیت 125-127 GEV/C2 (گیگا الیکٹران وولٹ) کے درمیان ہے۔ جو مجوزہ ھگس بوزان سے ملتی جلتی ہے۔ یہ کمیت آئن سٹائن کی مساوات E=mc سے نکالی گئی ہے۔

1993ء میں (Mr Leon Lederman) نے اس موضوع پر ایک کتاب شائع کی تھی جس کے بعد میڈیا نے اس بوزان کا نام (God Particle) رکھ دیا تھا۔ اس نام کو سائنسدانوں نے پسند نہیں کیا۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ واقعی ایک اہم ذرہ ہے لیکن اس کا خدا سے کوئی مخصوص تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی Mystery پائی جاتی ہے۔

اس مجوزہ ذرے کی تلاش میں دنیا بھر کے سائنسدان گزشتہ تقریباً تین عشروں سے دنیا میں ہونے والے سب سے بڑے اور اہم تجربے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے لیے فرانس اور سویٹزرلینڈ کی سرحد پر ایک سو میٹر زیر زمین ایک طویل سرنگ کھودی گئی۔ تمام تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد ایک بہت بڑی مشین کے ذریعے اس سرنگ میں ذرات کو انتہائی تیز رفتاری سے آپس میں ٹکرایا گیا۔ اس تجربے میں (Sub Atomic Particles) پر مشتمل دو شعاعوں کو استعمال کیا گیا۔ اس میں دونوں شعاعیں یا تو پروٹانز یا لیڈ آئنز (Lead Ions) پر مشتمل تھیں۔ انہی شعاعوں کو ہیڈران کہا جاتا ہے۔ ان دونوں شعاعوں کو ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں ایک دائرے کی شکل والے Accelerator کے ذریعے انتہائی تیز رفتاری سے سرنگ میں چھوڑا گیا تا کہ بگ بینگ کے بعد رونما ہونے والی صورت حال پیدا کی جا سکے۔ اس تجربے کے نتیجے میں اس بوزان کی دریافت ہوئی۔ ایکسیلیریٹر ایک بہت بڑی مشین ہے جس کا نام (The Large Hadron Collider (LHC) ہے۔ جو جنیوا کے نزدیک ایک سو میٹر زیر زمین موجود ہے۔ قوانین فطرت انسانی علم کے آگے کس سرعت سے سرنگوں ہو رہے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی تیس سال پہلے سٹیفن ہاکنگ نے (Grand Unified Theory) کے ذکر میں ایسی مشین کا تصور ذکر کیا تھا جو ذرات کو انتہائی تیز رفتاری (روشنی کی رفتار کے قریب) سے پھینک سکے۔ لیکن اس کے خیال میں یہ اتنی بڑی مشین ہوگی جتنا کہ ہمارا نظام شمسی۔ اس کے اپنے الفاظ میں

"But a machine that was powerful enough to accelerate particle to the grand unification energy would have to be as big as the solar system" (A Brief History of time page 79).

یہ نئی دریافت بڑی اہم ہے اس کی وجہ سے کائنات کے بارے میں نئے نئے تصورات سامنے آئیں گے۔ پرانے نظریات میں تبدیلی آئے گی۔ اس تجربہ سے Sub Atomic کی ننھی سی دنیا سے لے کر کائنات کی عظیم وسعتوں تک انسانی علم میں انقلاب آئے گا۔ اور پھر (Quantum Machines) اور (General Theory of Relativity) کے درمیان جو دوری پائی جاتی ہے شاید اس میں بھی کچھ کمی آسکے۔ اس دریافت کے بعد میڈیا میں اس پارٹیکل کا بہت چرچا ہو رہا ہے اور طرح طرح کے خدشات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اس دریافت کے بعد حضرت نوحؑ کے سیلاب سے بھی بڑھ کر تباہی اور بربادی آنے والی ہے۔ یا اب انسانوں کی ٹیلی ٹرانسفر ممکن ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ میرے خیال میں تباہی و بربادی آئی بھی تو اس کی وجہ یہ ذرہ نہیں ہوگا یہ حادثات قوانین فطرت کے تحت آتے ہیں۔ اور نہ ہی انسان کا (Waves) میں تبدیل ہونے کا خدشہ ہے۔

CERN کے اسی ادارے نے اس تجربہ کے حوالے سے گزشتہ سال یہ اعلان کر کے دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا کہ ایسے ذرات بھی دریافت ہوئے ہیں جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس سال اس کی یہ کہہ کر تردید کر دی گئی کہ کمپیوٹر کی خرابی کی وجہ سے ایسا ہو گیا۔ اس دریافت کے ٹھیک ایک ماہ بعد ماہرین فلکیات کے لیے خصوصاً اور فلکیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً ایک اور خوشخبری سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ NASA کی خلائی گاڑی (Curiosity) سرخ سیارے مریخ پر کامیابی سے اتر گئی ہے۔ یہ اصل میں ایک روبوٹ ہے جو دو سال وہاں رہ کر اس سیارے سے متعلقہ مفید معلومات مہیا کریگا۔

منظور حسین لیل بھکر

پرویز صاحب کا نظریۂ تاریخِ اسلام

حضور کریم ﷺ اور اُن کے صحابہ کرامؓ کے زمانے کی تاریخ کے واقعات کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ کیونکہ اُن عظیم ہستیوں کے فضائل و کردار کو قرآن کریم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

تاریخِ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا فرق:۔ ہم نے پرویز صاحب کے ''نظریۂ قرآن'' میں دیکھا کہ ان کی تحقیق کے مطابق علمِ تاریخ کو ایک سائنس کا درجہ دنیا میں سب سے پہلے قرآن کریم نے عطا کیا۔ اور قرآن کریم اپنے دعاوی کو برحق ثابت کرنے کے لئے تاریخی واقعات کے نتائج کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن اسلام کے دورِ اول کی تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ مختلف ہے۔ ان کے اس نظریئے کا تعلق اس دور کے حالات و واقعات کی صحت سے ہے۔ اور ان کی صحت کی جانچ پرکھ کے لئے بھی وہ قرآن کریم کو معیار قرار دیتے ہیں۔ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۷۳ء میں جناب شورش کاشمیری (مرحوم) کے ہفت روزہ ''چٹان'' کے ساتھ ان کا ایک تحریری انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں ''اسلامی تاریخ'' پر ان کے نظریئے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔ ''اسلامی تاریخ'' کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ایک چیز ہے ''اسلام کی تاریخ'' اور دوسری چیز ہے ''مسلمانوں کی تاریخ''۔ اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ اسلام درحقیقت تھا کیا؟۔ اور پھر وہ کس طرح رفتہ رفتہ مروّجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا؟۔ جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے، اسلام کی اس قسم کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ باقی رہی مسلمانوں کی تاریخ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کی سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ ہے۔ عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی تاریخ میں اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس دورِ ہمایوں میں مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ بھی ہمارے پاس اپنی حقیقی اور غیر ملوث شکل میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی جامع تاریخ 'تاریخ طبری' ہے جسے اُم التواریخ کہا جاتا ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی کے ابتداء میں، کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر، روایات کی رو سے مرتب ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ اس کے بعد مرتب ہونے والی کتبِ تاریخ کی بنیاد بھی یہی تاریخ ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وضعی احادیث اور ہماری تاریخ ہے۔ ان میں ہر شخص کو اپنے اپنے نظریئے کی تائید میں روایات مل جاتی ہیں جسے وہ ''اسلام'' کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اُمت کے اختلافات،

نزاعات‘ تفرقات اور غیروں کی طرف سے اعتراضات کا سرچشمہ بھی یہی چیزیں ہیں۔ جہاں تک عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کا تعلق ہے‘ اس کی ’’منزہ تاریخ‘‘ مرتب کی جاسکتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کی زندگی قرآن کریم کے مطابق تھی لہٰذا‘ ہمیں اُس دور کی تاریخ کو قرآن کی چھلنی میں چھان لینا چاہیئے۔ جو اس کے مطابق ہو‘ اسے صحیح سمجھ لینا چاہیئے‘ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ میں نے اپنی کتابِ سیرت (معراج‘ انسانیت) کو اسی معیار کے مطابق مرتب کیا ہے اور اس کا نتیجہ بڑا شاداب اور درخشندہ سامنے آیا ہے۔ اسے ہم پورے حتم واعتماد کے ساتھ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں۔ اس نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل ودماغ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ (یاد رہے کہ اس انٹرویو کی اشاعت کے تقریباً تین ماہ بعد نومبر ۱۹۷۳ء میں پرویز صاحب کی شہرہء آفاق کتاب ’’شاہکارِ رسالت‘‘ سامنے آئی جو اسی معیار کے مطابق لکھی گئی جس کے مطابق ’’معراجِ انسانیت‘‘ لکھی گئی تھی۔ مؤلف)۔ باقی رہی بعد کے دور کے مسلمانوں کی تاریخ تو نہ ہم اُن کے اعمال وکردار کی صداقت کے لئے مکلّف ہیں‘ نہ ہی انہیں اسلام کے لئے سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔‘‘ (صفحہ نمبر ۴۷۔۴۶)۔

تاریخ اور عقیدہء ختمِ نبوت:۔ احادیث کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث کس طرح جمع اور مرتب کی گئیں‘ اور دین کا ذریعہء علم ہونے کی جہت سے وہ کس قدر ظنّی اور غیر یقینی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے دورِ اوّل کی تاریخ میں بھی صحیح کے ساتھ ساتھ بہت سے غلط واقعات شامل ہو گئے جو اُمت میں اختلافات اور تفرقہ بازی کا سبب بنے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا دورِ اوّل اس قدر الجھا کر پیش کیا گیا ہے کہ شبہ پڑتا ہے کہ آخری وحی بھی اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے عقائد اور اعمال وکردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ اور وہ لوگ جوں کے توں رہے۔ وہی نسلی تفاخر‘ وہی باہمی نفرتیں‘ وہی قبائلی عداوتیں اور رقابتیں اور وہی حرص‘ وہی لالچ‘ ایک دوسرے کو داؤ لگانے کے وہی انداز۔ مسلمان اپنی تاریخ کے آغاز ہی میں باہم دگر دست وگریباں دکھائی دیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دورِ اوّل کی تاریخ کے تمام واقعات کو صحیح مان لیا جائے تو یوں لگے گا کہ آخری وحی کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ صرف وقتی طور پر عربوں کا وحشی پن دب گیا۔ حضور کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اُن کی حالت ایسی نظر آتی ہے کہ ایک نئے نبی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے جو عربوں کو پھر ایک بار راہِ راست پر لاتا کیونکہ حضور کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا تو اُن لوگوں پر (معاذ اللہ) کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ فرق صرف اتنا نظر آئے گا کہ حضور کریم ﷺ کے بعد اب عرب ’’مسلمان‘‘ کہلانے لگے اور اُن کی ’’ایک حکومت‘‘ قائم ہو گئی۔ عربوں میں آزادانہ اور انا پرستانہ قبائلی جنگوں کی جگہ جذبہء ہوسِ اقتدار کے تحت سازشیں اور جنگیں شروع ہو گئیں جن کے باعث اسلامی نظام صرف تیس سالوں تک بھی کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا اور باہمی نفرتوں اور قتل وغارت کا شکار ہو گیا۔ مسلمانوں کی معلوم اور دستیاب تاریخ بتاتی ہے کہ ابھی حضور کریم ﷺ کا جنازہ پڑھا بھی نہیں گیا تھا کہ ایمان والے آپس میں الجھ پڑے۔ اور اُن کی تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد تو مسلمانوں نے جی بھر کر ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر دیا۔ (ملاحظہ ہو مولانا

مودودیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''خلافت وملوکیت'')۔ یہ مان لینے سے کہ حضور کریم ﷺ کے صحابہؓ پر آخری وحی اور آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت کا کوئی اثر نہ ہوا' یا یہ اثر (قرآنِ کریم کی شہادت کہ لوگ دین میں فوج درفوج شامل ہوگئے۔۲/۱۱۰۔ کے برعکس) صرف چند لوگوں تک محدود رہا' یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایسا مان لینا عقیدہء ''ختمِ نبوت'' کے خلاف ہے۔ لہٰذا' اس معاملے میں مسلمانوں کو بے حد احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

خلافت سے ملوکیت:۔ مسلمانوں کی تاریخ میں نظامِ خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی کا ذمے دار صحابہء کرامؓ (خصوصاً خلیفہء سوم حضرت عثمانؓ) کو ٹھہرانے کی بجائے اس غیر اسلامی تبدیلی کو اُن حالات وواقعات میں تلاش کرنا چاہیئے جن میں قانون کی مرکزیت ٹوٹی اور۔۔ دین' دنیا سے الگ ہوا۔۔ ''الدین'' ایک عام ''مذہب'' میں بدل گیا۔ حکمرانوں اور عمالِ حکومت نے دینی معاملات مثلاً مساجد (امامتِ نماز وغیرہ) کو چھوڑ کر صرف حکمرانی کے معاملات کو اپنا فریضہ سمجھا۔ مسجد کی دینی حیثیت' مذہبی حیثیت میں بدل گئی۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت وجود میں آئی۔۔۔ یعنی' اب حکومت کی طرف سے صرف دنیاوی (سیاسی) احکامات جاری ہونے لگے اور مذہبی معاملات کے بارے میں فقہاء (مذہبی پیشوائیت) کا الگ اور آزاد وجود سامنے آیا۔ پبلک اور پرسنل لا زالگ الگ ہوگئے۔ انفرادی طور پر قانون سازی (فقہ سازی) نے فرقہ بندی (سیکولرازم) کو جنم دیا۔ ہر فرقہ کی نمازیں اور مساجد اپنی اپنی فقہ کی بناء پر الگ ہوگئیں۔ عباسی دور تک اگرچہ بہت سی قباحتوں کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے مگر الگ فقہ جات' اور ان کی بنیاد پر الگ فرقوں' الگ نمازوں اور الگ مساجد کا نشان نہیں ملتا۔۔ جب حکمرانوں نے دنیاوی امور (سیاسی اور معاشی امور وغیرہ) اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور مذہبی امور (مساجد' نمازیں' روزے' نکاح' طلاق وغیرہ) مذہبی پیشوائیت کے حوالے کر دیئے تو نظامِ خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔۔۔ اور خلافت سے ملوکیت میں تبدیلی کا یہ لمحہ ہمیں اُس وقت متعین ہوتا نظر آتا ہے جب ہم ائمہ فقہاء (حضرات امام جعفر صادقؒ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام حنبلؒ وغیرہ' جن کے زمانوں میں بہت معمولی فرق ہے) کو انفرادی فقہ سازی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جب کہ اُس سے قبل ہر (دینی اور دنیاوی) قانون اور حکم' مرکزِ خلافت سے جاری ہوتا تھا۔ انفرادی قانون سازی کا تصور تک نہیں تھا۔۔ (شیعہ حضرات کی فقہ جعفریہ بھی۔ اپنے نام ہی سے۔ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ سے پہلے کسی امام صاحب کی فقہ سامنے نہ آئی)۔۔ تشکیلِ فقہ کا زمانہ ہی خلافت سے ملوکیت میں تبدیلی کا واضح تعین کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک مرکز سے ہر قسم کے قوانین کا اجراء ہوتا رہا اور ساری امت ان پر عمل کرتی رہی' اس وقت تک کسی قسم کی انفرادی فقہ (قانون) سازی کی ضرورت کسی کو پیش نہ آئی۔۔۔ انفرادی قانون سازی خلافتِ عباسیہ میں شروع ہوئی۔۔۔ عباسی دور ہی عملاً' ملوکیت (سیکولرزم) کا مظہر ہے۔۔۔ اس بارے میں مزید' نظریہء اجتہاد (تشکیلِ فقہ کا زمانہ) کے تحت ملاحظہ فرمائیں (موءلف)۔

معیارِ تاریخ اسلام:۔ پرویز صاحب نے اپنی منفرد تصنیف ''شاہکارِ رسالت'' میں مسلمانوں کے دورِ اوّل کی تاریخ کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ اُن کے مطابق مسلمانوں کے اُس دور کی تاریخ میں ہمیں صحیح اور غیر صحیح، دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ تاریخی واقعات کو یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تاریخ نویسی میں وضعی واقعات یا واقعات کو اپنے رنگ میں، اپنے عقائد و رجحانات کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے۔ پرویز صاحب حضور کریم ﷺ اور اُن کے صحابہ کرامؓ کے دور کی تاریخ میں درج واقعات کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی، معیارِ حدیث کی طرح، قرآن کریم ہی کو قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے دورِ اوّل کی تاریخ کے واقعات کو پرویز صاحب قرآن کریم کی روشنی میں دیکھنے کے قائل ہیں کیونکہ قرآن کریم ایک یقینی اور محفوظ ذریعہ علم اور معیارِ اعلیٰ ہے جبکہ تاریخ ایک ظنّی، قیاسی اور سُنی سُنائی پر مبنی غیر محفوظ ذریعہ۔ قرآن کریم کی تعلیم اور حضور کریم ﷺ کی تربیت نے ''والذین معہٗ (حضور کریم ﷺ کے ساتھیوں)'' کے عقائد اور اعمال و کردار میں حیران کن انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُن عظیم لوگوں کی خصوصیات اور فضائل و کردار کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن اُس دور کی تاریخ اُن لوگوں کی قرآنی خصوصیات کی قطعاً تائید نہیں کرتی۔ مثلاً قرآن کریم اُن لوگوں کو ''رحماءُ بینھم (آپس میں محبت کرنے والے)'' قرار دیتا ہے جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اُنہوں نے اپنی قبائلی عصبیتوں کو بدستور برقرار رکھا، اُن کی دلوں کی کدورتیں دور نہ ہو سکیں، اُنہوں نے حصولِ اقتدار اور پرانی دشمنیوں کے بدلے چکانے کی خاطر قرآنی اصولوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے آپس میں خوفناک جنگیں لڑیں اور گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے ستر ستر ہزار آدمی قتل کر دیئے۔ ایک مسلمان کے لئے ایک طرف قرآن ہے اور دوسری طرف تاریخ۔ ایک طرف یقینی، جبکہ دوسری طرف ظنی اور نا قابلِ اعتماد ذریعہ علم ہے۔ اب، یا تو قرآن کریم کی شہادت کو تسلیم کیا جائے یا پھر تاریخ کو مانا جائے (مئولف)۔

پرویز صاحب ''سلیم کے نام'' کے انتالیسویں خط میں ''ہماری تاریخ میں کیا ہے'' کے عنوان کے تحت تاریخ اسلام کے بارے میں مروجہ نظریات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ''اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اُس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو حاصل ہوگی۔ قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی پوزیشن:۔ جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس میں شبہ اور شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے (خواہ وہ کتبِ احادیث میں ہو اور خواہ کتبِ سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہ ﷺ نے مدوّن کرا کر اُمت کو دی، نہ خلفائے راشدینؓ نے انہیں مرتب کیا۔ نہ ہی ان میں سے کوئی

کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب، جسے اُم التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اُس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا جن سے ان کتبِ احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انہوں نے اپنے ہمعصروں کی زبانی سنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اوّلیں کتابوں کی پوزیشن جن سے سیرتِ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سامنے آتی ہے۔ (واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیّبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیاتِ کبریٰ خود قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہیں، لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتبِ احادیث و سیَر وغیرہ میں موجود ہے)۔ قرآن اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ہے، اس سے ہر صاحبِ بصیرت اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ ہے جس کے لئے کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے۔

قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق:۔ اب رہے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصولِ کار واضح ہیں یعنی:۔ (۱)۔ ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے مطابق تھی۔ (۲)۔ لہٰذا، اگر تاریخ میں نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ اس طرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آجائے گی۔'' اس کے بعد، اس خط میں مسلمانوں کی تاریخ کے وہ واقعات و نظریات بیان کئے گئے ہیں جو حضور کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد کے بیان کئے جاتے ہیں، مگر دراصل وہ قرآن کی تعلیم کے خلاف، فلہٰذا، غلط ہیں (مئولف)۔

طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۰ء ص۔ ۱۷۔ ''صحابہء کبارؓ کے متعلق جو کچھ ہماری تاریخ میں آیا ہے اسے آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ یہ تاریخ، اُس دور سے اڑھائی تین سو سال بعد، زبانی روایات کی بناء پر مرتب ہوئی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب امت کی گاڑی مدت سے، اسلامی نظام کی پٹڑی سے اتر کر، ملوکیت کے راستے پر پڑ چکی تھی۔ عہدِ رسالت مآب ﷺ اور دورِ صحابہؓ سے متعلق تاریخ کے ردّ و قبول کا معیار قرآن کریم کو قرار دینا چاہیئے۔ اس (تاریخ) میں ان حضرات کے متعلق جو کچھ آیا ہے، اگر وہ اس سیرت و کردار کا مظہر ہے جسے قرآن نے مومن کا شعار قرار دیا ہے تو اسے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اس تاریخی بیان کو دیوار پر دے

مارنا چاہیئے۔اس لئے کہ اسے صحیح تسلیم کرنے سے قرآن کی وہ شہادت غلط قرار پاتی ہے جو ان کے متعلق اس میں بصراحت مذکور ہے۔ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں۔زید، بکر، عمر کے نوشتوں پر نہیں۔''

ہمارا منفرد نظریہ:۔ پرویز صاحب نے اپنی شہرہء آفاق تصنیف ''شاہکارِ رسالت'' میں ''گزرگاہِ خیال'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ۔''تاریخ کے سلسلہ میں ہماری (مسلمانوں کی) کیفیت باقی دنیا کے مقابلہ میں مخصوص اور منفرد ہے۔قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ہم حرفاً حرفاً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔اب اگر تاریخ میں کوئی بات ایسی ملے جو قرآن کے کسی بیان کے خلاف ہو، تو اسے ہم کبھی صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔(مثال کے طور پر) قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے عزیزِ مصر کی بیوی کے اصرار کے باوجود اپنے دامن عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔اب اگر کوئی تاریخ، حضرت یوسفؑ کے بے شمار محاسن بیان کرنے کے ساتھ یہ کہے کہ انہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا تو ہم ان محاسن کو تو صحیح تسلیم کر لیں گے لیکن ان کی طرف منسوب کردہ دست درازی کے واقعہ کو کبھی صحیح تسلیم نہیں کریں گے۔اس پر اگر دنیا یہ کہے کہ تمہاری یہ روش بڑی غیر علمی ہے کہ تم تاریخ کے ایک حصے کو صحیح تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کو غلط۔تو ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ ایسے معاملات میں تاریخ کے پرکھنے کا ہمارا معیار تم سے مختلف ہے۔ہم تاریخ کے کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے جو قرآنی تصریحات سے ٹکراتا ہو۔اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہوگا کہ ہم علمی تحقیق سے یہ ثابت کریں کہ قرآنی تصریح مبنی برحقیقت ہے اور تاریخ کا بیان غلط۔لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے، ہم قرآنی بیان کو غلط قرار نہیں دیں گے۔ایک غیر مسلم کی تو یہ پوزیشن ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کے جس بیان کو جی چاہے صحیح تسلیم کرے جس سے چاہے انکار کر دے، لیکن قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا یہ مؤقف نہیں ہو سکتا۔انہیں تو قرآن کے ایک ایک حرف کو برحق تسلیم کرنا ہوگا۔اگر کسی کو، قرآن مجید کے کسی بھی بیان پر شبہ ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ان تصریحات کی روشنی میں آپ مسئلہ زیرِ نظر پر غور فرمائیے:۔

(۱):۔قرآن مجید میں صحابہ کبارؓ (مہاجرین وانصار) کے متعلق بہ صراحت کہا گیا ہے کہ وہ مومنینِ حقّا (پکے اور سچے) مومن تھے۔

(۲):۔قرآن مجید میں مومنین کی صفات اور خصوصیات بہ صراحت بیان کی گئی ہیں۔

(۳):۔اس سے واضح ہے کہ صحابہ کبارؓ ان صفات وخصوصیات کے پیکر تھے جو مومنین کے متعلق قرآن میں آئی ہیں۔

(۴):۔اگر تاریخ میں صحابہؓ کی ایسی خصوصیات کا ذکر آتا ہے، جنہیں قرآن مومنین کی صفات بتاتا ہے، تو ہم تاریخ کی ان شہادات کو صحیح تسلیم کریں گے۔لیکن اگر اس میں صحابہؓ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی گئی ہے جو ایک مومن کے شایانِ شان نہیں، تو ہم تاریخ کے اس بیان کو بلا تامل مسترد کر دیں گے۔یہ اس لئے کہ ایسی صورت میں سوال، تاریخ کے دو بیانات کا نہیں ہوگا، اس میں ایک طرف خدا کا نازل کردہ قرآن ہوگا اور دوسری طرف، انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ۔ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں، کسی طبری یا ابن اثیر

پر ایمان لانے کے نہیں۔ اگر قرآن کے مقابلہ میں طبری اور ابن اثیر (وغیرہم) کی ہزار تاریخیں بھی غلط ثابت ہوتی ہیں تو ہوا کریں، لیکن ہم ان مورخین کی خاطر، قرآن مجید کے ایک لفظ کو بھی غلط تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

لمم:۔ ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن کریم نے ان حضرات (صحابہؓ) کو ''معصوم'' قرار نہیں دیا۔ ان سے سہو و خطا اور اجتہادی غلطیوں کا امکان تھا۔ اس باب میں خود قرآن کریم نے وضاحت کر دی ہے کہ مومنین کا شعارِ زندگی یہ ہے کہ ''یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ'' (53:32)۔ وہ کبائر الاثم اور فواحش سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ ان سے ''لمم'' سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ''لمم'' کے معنی ہیں، یونہی کبھی کبھار بلا ارادہ کسی ناپسندیدہ بات کا سرزد ہو جانا۔ اس کو سہو و خطا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:۔ ''اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ'' (7:201)۔ یعنی ''متقیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی کوئی شیطانی خیال یونہی گھومتے گھماتے انہیں چھو جائے تو وہ ہدایتِ خداوندی کو سامنے لے آتے ہیں اور اس سے ان میں فوراً بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔'' بنابریں، ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے سلسلہ میں ''لمم'' کی حد تک تو کسی تاریخی بیان کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی طرف منسوب کردہ کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا جو مومن کے شایانِ شان نہ ہو۔

فرقِ فہم و ادراک:۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے فہم و ادراک کی صلاحیتوں میں فرق تھا اور اس اعتبار سے انہوں نے تعلیم و تربیتِ نبوی ﷺ سے جو کچھ اخذ کیا، اس میں تفاوتِ مراتب ضروری تھا لیکن ان میں سے کسی سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہو سکتی تھی جو مومنِ حقا کی خصوصیات کے خلاف ہو۔ اس باب میں وہ سب یکساں تھے۔ فلہٰذا یکساں احترام کے مستحق۔ رضی اللہ عنھم ورضوعنہ ان سب کے لئے تھا۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائیں کہ مہاجرین و انصار کے زمرے میں کس کس کا شمار ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس ذریعہ بھی کون سا ہے جس سے ہم اس قسم کی فہرستیں مرتب کر سکیں۔ ذریعہ ہمارے پاس تاریخ ہی ہے۔ لہٰذا تاریخ نے جس کے متعلق بھی ایسا کہہ دیا ہے، ہم اسے اس زمرہ میں شامل سمجھ لیں گے اور اس کا احترام کریں گے۔ اس لئے کہ اگر تاریخ نے کسی اور کو بھی اس فہرست میں شامل کر دیا ہے تو اس کا احترام کرنا خدا کے ہاں جرم قرار نہیں پائے گا، لیکن اگر اس فہرست میں شامل حضرات میں سے کسی کے متعلق ہم نے سوءِ ظن سے کام لیا تو اس کی بابت ہم سے ضرور مواخذہ ہوگا۔ بنابریں، صحابہ کبارؓ میں سے کسی کے متعلق بھی بدظنی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ وہ سب واجب الاحترام ہیں۔ باقی رہے ان کے بعد کے مسلمان، سو ان کے مومنینِ حقا تسلیم کر لینے کے متعلق قرآن کریم ہمیں مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ ان کے اعمال کس قسم کے تھے، اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ ان کے متعلق ہمارا موقف از روئے قرآن یہ ہے کہ:۔ ''تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' (2:141)۔ ''یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔''

میرا مسلک اور مشن:۔ ''یہ ہے میرا موقف تاریخ کے سلسلہ میں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے' اسلام پر جس قدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں' اور اس کی جس قدر گھناؤنی تصویر سامنے لائی جاتی ہے' اس کی ذمے داری ہماری کتبِ روایات و تاریخ پر عائد ہوتی ہے۔ بنابریں' اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قرآن کریم کو معیار قرار دے کر عہدِ رسالتمآب ﷺ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے۔ یہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ میرا بہر حال! یہی مسلک اور مشن ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔ میں نے' اسی معیار کے مطابق' پہلے حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیّبہ کو مرتب کیا۔ اس کے بعد میں نے عہدِ صحابہؓ کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا تو دیکھا کہ وہ بھی رطب و یابس سے پٹی پڑی ہے۔ میں نے اسے بھی' قرآنی معیار کے مطابق پرکھا اور کھنگالا۔ اس سلسلہ میں' میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے' اسے مغربی مورخین کے معیار کی رو سے' ہسٹو ریکل ریسرچ (تاریخی تحقیق) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں' تاریخی تحقیق کی گنجائش ہی نہیں اور جو اس کا دعویٰ کرتا ہے' وہ یا تو غلط فہمی میں مبتلا ہے یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ ہمارا سارا تاریخی سرمایہ متقدّمین کی چند کتابیں ہیں' جو صدرِ اوّل کے صدیوں بعد' بغیر کسی سابقہ ریکارڈ کے' محض بر بنائے روایات' مرتب ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں کے ''محققین'' اس سے زیادہ کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ ان کتابوں میں سے' اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق' واقعات منتخب و مقتبس کر کے ایک نئی تالیف مرتب کر دیں۔ میں نے بھی یہی کیا ہے' لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میرا معیارِ انتخاب و اقتباس' میرا ذاتی نقطۂ نگاہ نہیں بلکہ غلط اور صحیح کا قرآنی معیار ہے۔ میری پیشکش اسی اعتبار سے منفرد ہے' اور (میرے نزدیک) اس لئے اہم کہ یہ میرے مدّت العمر کے مطالعہ اور فکر کی ماحصل اور میری زندگی کا نقطۂ پرکار تمنا ہے۔''

تاریخ دورِ اوّل:۔ اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ کے بارے میں ایک بار پھر پرویز صاحب کی اس تحقیق کو' جو ان کے نظریہ حدیث کے تحت (مؤلف کے خط کے جواب میں) بیان کی گئی ہے' سامنے لانے سے مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ تحریر ''طلوعِ اسلام'' اکتوبر ۱۹۷۹ء (ص۔۹ تا ۲۱) میں شائع ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں کہ ''احادیث سے آگے بڑھ کر تاریخ کی طرف آیئے! اسے بھی ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا حقائق کا تجزیہ کر کے دیکھیئے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ مدینہ منورہ عہدِ رسالت مآب ﷺ اور اوّلین تین خلفائے راشدین کے زمانے تک اس مملکت کا دارالخلافہ رہا جس کی حدود مختلف براعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے نظم و نسق کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہوگا۔ تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے۔ دستاویزات ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔ مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ خط و کتابت ہوتی ہوگی۔ دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حسابات رکھے جاتے ہوں گے۔ اس سیکریٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔ لیکن کیا یہ حقیقت موجبِ صد حیرت نہیں کہ ان میں سے کاغذ کی ایک چٹ تک بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اُس زمانے سے آج تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور آباد اور شاداب رہا۔ اس پر باہر سے نہ کوئی حملہ ہوا جس کی بدولت وہ ریکارڈ ضائع ہو گیا ہو' نہ کوئی زلزلہ آیا کہ وہ عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں' نہ کوئی ایسی آگ لگی' نہ کوئی سیلاب آیا۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر صفدر محمود

کیا قائداعظم سیکولر تھے؟

ڈاکٹر صفدر محمود کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حال ہی میں حضرت قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کے دین و مذہب کے بارے میں ایک بار پھر بے سروپا باتیں کی گئیں تو ان کا جواب ڈاکٹر صاحب 25 اگست سے روزنامہ نوائے وقت میں قسط وار لکھ رہے تھے۔ جو کہ اب یک جا آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔ قائداعظم کے بارے میں تقریباً یہی موقف پرویز صاحب کا تھا جسے وہ بار بار اپنی زندگی میں دہراتے رہے۔ اس ضمن میں ان کا مقالہ ''کیا قائداعظم سیکولر پاکستان چاہتے تھے'' اہمیت کا حامل ہے جسے ادارہ نے الگ ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا ہے۔ مدیر

سوال یہ ہے کہ کیا بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ سیکولر تھے۔ سیکولر کے لغاتی معانی ہیں لادین، دنیاوی، لیکن عام مفہوم کے مطابق سیکولر ایسے شخص کو سمجھا جاتا ہے جو دین اور دنیا کو الگ الگ تصور کرتا ہو یعنی مذہب کو محض ذاتی معاملہ سمجھتا ہو اور قومی سیاست کو اپنے مذہب یا دین سے بالکل پاک اور علیحدہ رکھنے کا قائل ہو۔ اس ضمن میں مغربی ممالک کی مثال دی جاتی ہے جہاں چرچ اور ریاست جدا جدا ہیں اور سیاست پر مذہب کی پرچھائیاں نہیں پڑتیں۔ پاکستان میں ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے کہ کیا قائداعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام قائم کرنا چاہتے تھے؟ ایک اقلیتی دانشور حلقہ یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کو اسلام سے بالکل پاک اور صاف رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد ایک سیکولر جمہوری ریاست کا قیام تھا۔ یہاں اقلیتی حلقہ سے مراد چھوٹا گروہ ہے۔ دوسری طرف اکثریتی حلقے کا اصرار ہے کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر ہی معرض وجود میں آیا، مذہب ہی پاکستان کے مطالبے کا طاقتور ترین محرک تھا اس لئے پاکستان کے ریاستی ڈھانچے اور آئین و سیاست کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کر کے ہی تصور پاکستان کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ نظریاتی حلقے کے دانشوروں کا خیال ہے کہ اگرچہ تحریک پاکستان کے محرکات میں معاشی، سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل وغیرہ نے اہم کردار سرانجام دیا لیکن ان میں سب سے زیادہ موثر فیکٹر مذہب کا تھا جس کے سبب عوام نے بے پناہ قربانیاں دیں، صعوبتیں برداشت کیں، آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر پاکستان پہنچے۔ اس سے قطع نظر اگر پاک و ہند کے مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ احساس پوری

طرح جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی صحیح معنوں میں بقاء کیلئے ایک مسلمان ریاست کا قیام ضروری ہے۔ دراصل یہ احساس ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے تجربات کا نتیجہ تھا۔ خود قائداعظمؒ نے بھی اپنی تقریروں میں یہ بات کئی بار کہی۔

کسی بھی شخصیت کے نظریات اور تصورات کو سمجھنے کیلئے اس کی ذاتی زندگی میں جھانکنا اور اس کی عوامی زندگی کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے اور عوامی زندگی کو سمجھنے کیلئے تقریریں، تحریریں، رجحانات اور سرگرمیاں مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ مثلاً ہم نے قائداعظمؒ کی ہر سوانح عمری میں یہ واقعہ پڑھا ہے کہ جب وہ لندن میں بیرسٹری کیلئے داخلہ لینا چاہتے تھے تو انہوں نے لنکز ان کو اپنی درسگاہ کے طور پر اس لیے منتخب کیا کہ لنکز ان میں دنیا کے عظیم ترین آئین یا نظام قانون دینے والوں (Greatest Law Givers) کی فہرست میں ہمارے نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کا نام گرامی بھی شامل تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے اس سے متاثر ہو کر لنکز اِن میں داخلہ لیا اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا چونکہ اس واقعہ کا انکشاف خود قائداعظمؒ نے کراچی میں عید میلا دالنبی کے موقع پر کیا تھا اس لیے یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے۔ اسی حوالے سے میں خود بھی لندن میں خاص طور پر لنکز ان دیکھنے گیا تھا۔

میں نے بھی جب یہ واقعہ پڑھا تو اسے اس کے صحیح تناظر میں نہ سمجھ سکا کیونکہ بظاہر قائداعظمؒ مغربی طرز حیات کا نمونہ نظر آتے تھے، وہی مغربی لباس، وہی انگریزی زبان، وہی اطوار.....اس کے برعکس اس بنیاد پر لنکز ان کو منتخب کرنے کا فیصلہ صرف وہی شخص کر سکتا تھا جس کا دل حب رسول سے منور ہو کیونکہ عام حالات میں ایک سترہ سالہ کم سن نوجوان اور پھر لندن کی آزاد فضا میں کون ان باتوں کی پروا کرتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ قائداعظمؒ کا تعلق ایک تجارت پیشہ خوجہ فیملی سے تھا نہ کہ علامہ اقبال کی مانند ایک ٹھوس مذہبی گھرانے سے.....بچپن کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ عام طور پر نوعمری کی تربیت کے شخصیت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے قائداعظمؒ کے لنکز ان کے انتخاب کا صحیح پس منظر اور مفہوم اس وقت سمجھ میں آیا جب میں نے سید رضوان احمد کی کتاب ''قائداعظمؒ کی زندگی کے ابتدائی تیس (30) سال'' پڑھی۔ اس کتاب میں مصنف نے گہری تحقیق کے بعد قائداعظمؒ کے بچپن کے بارے میں کچھ ایسی معلومات کا انکشاف کیا ہے جو اس سے قبل منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ قائداعظمؒ کے والد گرامی تجارت کے ساتھ ساتھ مشن ہائی سکول کراچی میں پڑھاتے بھی تھے لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کو شروع میں سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کروایا کیونکہ مشن سکول میں عیسائیت کا پرچار بھی کیا جاتا تھا جبکہ سندھ مدرستہ الاسلام میں بچوں کی دینی تربیت پر توجہ دی جاتی تھی۔ مدرستہ الاسلام کے ریکارڈ کے مطابق محمد علی جناح کے نام کے سامنے والے خانے میں حسب رواج خوجہ لکھنے کی بجائے محمڈن لکھایا گیا۔ قائداعظمؒ سندھ مدرستہ الاسلام چھوڑ کر بمبئی گئے تو وہاں بھی انجمن اسلامیہ کے سکول میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں لندن جانے سے

قبل وہ مختصر سے عرصہ کیلئے کراچی کے مشن سکول میں بھی طالب علم رہے۔ سید رضوان احمد کی تحقیق کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح کے والد جناح بھائی پونجا مذہبی رجحانات رکھتے تھے اور شام کے وقت محلے کے بچوں کو قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے جبکہ قائداعظمؒ کی والدہ بچوں کو تاریخی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ کی تربیت قدرے مذہبی ماحول میں ہوئی اور اسی مذہبی تربیت کا اثر تھا کہ قائداعظمؒ نے لندن میں لنکز ان کا انتخاب کیا۔

حصول تعلیم کے بعد عملی زندگی کا آغاز کرنے کیلئے قائداعظمؒ 1896ء میں بمبئی پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس تھی۔ اسلام اور مسلمانوں سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے بمبئی میں فروکش ہوتے ہی انجمن اسلامی بمبئی کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس کی میٹنگوں میں شرکت کرنے لگے۔ انہوں نے انجمن اسلامی بمبئی کی میٹنگ میں پہلی بار 8 جولائی 1897ء کو شرکت کی اور پھر اسی سال 14 اگست کو انجمن اسلامی نے عید میلا دالنبی کے ضمن میں جلسہ کیا تو قائداعظمؒ اس میں بھی شریک ہوئے۔ عید میلا دالنبی کی تقریب کی نواب محسن الملک نے صدارت کی اور اس تقریب میں سیرت النبی پر تقریروں کے علاوہ نعتیں پڑھی گئیں اور سرور کائنات کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ قائداعظمؒ کی حضور نبی کریم ﷺ سے عقیدت کا اس سے پتا چلتا ہے کہ سیاسی و قانونی زندگی کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اکثر عید میلا دالنبی کی تقریبات میں شرکت کرتے رہے۔

قائداعظم 1910ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل (اعلیٰ ترین قانون ساز اسمبلی) کے رکن منتخب ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ایک دیرینہ مسئلے کو حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ پریوی کونسل کے ایک فیصلے کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے روایتی نظام وقف علی الاولاد پر زد پڑی تھی جس سے نہ صرف مسلمانوں کے مفادات متاثر ہوئے تھے بلکہ ان کا ایک صدیوں پرانا سسٹم بھی غیر موثر ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ مسلمان نہایت پریشان تھے اور برطانوی حکومت کے سامنے اپنے آپکو بے بس محسوس کرتے تھے۔

قائداعظمؒ نے کونسل کا رکن منتخب ہونے کے بعد وقف علی الاولاد کا بل کونسل میں پیش کیا اور پھر انکی کئی برس کی محنت اور مسلسل کوشش سے وہ قانون بن گیا۔ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں یہ پہلا بل تھا جو کسی مسلمان رکن نے مسلمانوں کے بارے میں پیش کیا اور وہ قانون بنا۔

1918ء میں انہوں نے بمبئی کی ممتاز شخصیت سر ڈنشا کی بیٹی رتی سے شادی کی تو شادی سے قبل قبول اسلام کی شرط رکھی۔ رتی ڈنشا پہلے مسلمان ہوئیں اور پھر ان کا نکاح محمد علی جناحؒ سے ہوا۔ میں نے اس حقیقت کی مولانا شاہ احمد نورانی سے تصدیق کی ہے کہ محمد علی جناحؒ رتی ڈنشا کو مولانا نورانی کے سگے تایا مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لیکر گئے جنہوں نے انہیں مسلمان کیا اور ان کا نکاح قائداعظمؒ سے پڑھوایا۔ مولانا نذیر احمد صدیقی اہل سنت تھے اور مولانا نورانی صاحب کے بقول قائداعظمؒ ان سے مذہبی معاملات میں رہنمائی لیا

کرتے تھے۔ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا اور وہ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔قائداعظمؒ نہایت ذہین اور محتاط انسان تھے اور ہر قدم سوچ کر اٹھاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق اثنائے عشری سے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انکے خاندان کا مذہبی پس منظر یہی تھا تو پھر انہوں نے اپنی ہونے والی بیوی کو قبول اسلام اور اپنے عقد میں لینے کیلئے اور نکاح پڑھوانے کیلئے کسی ایسی مذہبی شخصیت کا انتخاب کیوں نہ کیا جس کا تعلق اثنائے عشری سے ہوتا۔ظاہر ہے کہ شیعہ علما کی بمبئی میں کوئی کمی نہ تھی اگرچہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظمؒ مذہبی فرقہ پرستی سے ماوراء تھے اور اس صورت حال کی بہتر وضاحت انکے ایک جواب میں ملتی ہے ۔

ایک دفعہ کسی صاحب نے محض شرارت کرنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کیلئے قائداعظمؒ سے یہ سوال پوچھا تھا کہ آپکا تعلق سنی فرقے سے ہے یا شیعہ فرقے سے؟ تو قائداعظمؒ کا جواب تھا کہ ہادی اسلام حضور نبی کریم کا مذہب کیا تھا؟ یہ جواب ان کی سوچ، شخصیت اور مذہبی رجحان کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت اور دلچسپ اتفاق ہے کہ قائداعظمؒ کی واحد اولاد یعنی انکی بیٹی دینا جناح نے 14 اور 15 اگست 1919ء کی درمیانی شب کو جنم لیا۔ایک مورخ کے بقول انکی دوسری ''اولاد'' اسکے صحیح اٹھائیس برس بعد 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب کو معرض وجود میں آئی اور اسکا نام پاکستان رکھا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ اپنی اولاد کو دل و جان سے چاہتے تھے اور خاص طور پر دینا جناح انکی زندگی کی پہلی محبت کی آخری نشانی تھی لیکن اسکے باوجود جب دینا نے کسی مسلمان نوجوان کی بجائے ایک پارسی نوجوان نیوائل وادیا سے شادی کا فیصلہ کیا تو قائداعظمؒ نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس سے تعلق توڑ لیا۔دینا ان کے جگر کا ٹکڑا تھی، اس سے بیٹی کی حیثیت سے تعلقات رکھے جاسکتے تھے۔ہمارے ہاں اس قسم کی لاتعداد مثالیں ہیں کہ لبرل قسم کے مسلمان مذہبی رشتہ ٹوٹنے کے باوجود اولاد سے سماجی تعلقات نبھاتے رہے لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قائداعظمؒ نے بیٹی سے مذہب کا رشتہ منقطع ہونے کے بعد اس سے ہر قسم کے رشتے توڑ لئے۔دوستوں سے کبھی دینا کا ذکر تک نہ کیا جیسے ان کی کوئی اولاد ہی نہ تھی اور پھر مرتے دم تک دینا کی شکل نہ دیکھی۔شادی کے بعد دینا نے چند ایک بار اپنے والد گرامی کو خطوط لکھے۔قائداعظمؒ نے ایک مہذب انسان کی مانند ان خطوط کے جوابات دیئے لیکن ہمیشہ اپنی بیٹی کو ڈیئر دینا'' یا پیاری بیٹی کہہ کر مخاطب کرنے کی بجائے مسز وادیا کے نام سے مختصر جواب دیئے۔(بحوالہ سٹینلے والپرٹ، جناح آف پاکستان صفحہ 370)

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظمؒ کی بیٹی مسز وادیا اپنے باپ سے ملنے اور اپنے باپ گورنر جنرل کو دیکھنے کیلئے پاکستان آنا چاہتی تھی، اس نے اجازت چاہی، دوستوں نے قائداعظمؒ سے درخواست کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ

دینا پہلی اور آخر بار قائداعظمؒ کی وفات کے موقع پر ہی پاکستان آسکی اور مرحوم باپ کی میت پر آنسو بہا کر واپس چلی گئی۔ حضرت قائداعظمؒ کی نماز جنازہ ممتاز مذہبی شخصیت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی جن کا مسلک اظہر من الشمس ہے۔

وزیرآباد کے جناب محمد شریف طوسی صاحب عالم و فاضل انسان تھے۔ انہوں نے اس مشکل دور میں ملازمت کی مجبوری کے باوجود انگریزی زبان میں مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں اتنے مدلل مضامین لکھے کہ تہلکہ مچا دیا۔ یہ مضامین قائداعظمؒ کو بہت پسند آئے چنانچہ قائداعظمؒ نے انہیں ڈھونڈا اور بمبئی بلا کر چھ ماہ اپنے پاس رکھا۔ اس طرح طوسی صاحب کو قائداعظمؒ کو نزدیک سے دیکھنے اور انکی ذاتی لائبریری کو کھنگالنے کا موقع ملا کیونکہ قائداعظمؒ ان سے تحقیق اور لکھنے کا کام لیتے تھے۔ طوسی صاحب کا بیان ہے کہ قائداعظمؒ کی لائبریری میں سیرت النبی اسلامی تاریخ و قانون اور خلفائے راشدین پر بہت سی کتابیں موجود تھیں اور قائداعظمؒ اکثر اوقات خلفائے راشدین اور تفسیر پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔

غزوہ بدر کے بعد کا واقعہ کہ جب مسلمانوں کو فتح نصیب ہو چکی تھی حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اپنے والد گرامی سے ملے اور کہنے لگے کہ غزوہ بدر کے دوران ایک مقام ایسا آیا کہ آپ کی گردن میری تلوار کی زد میں تھی لیکن مجھے فوراً خیال آیا کہ آپ میرے والد ہیں چنانچہ میں نے ارادہ بدل لیا۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر تمہاری گردن میری تلوار کی زد میں آجاتی تو میں ہرگز باز نہ آتا اور تمہاری گردن مار دیتا..... گویا اسلام میں رشتے خون کے حوالے سے نہیں بلکہ دین کے حوالے سے قائم ہوتے ہیں۔ حضرت قائداعظمؒ نے اپنی اکلوتی بیٹی سے رشتہ توڑ کر اسی اصول کی پیروی کی کیونکہ دینا نے اسلام سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

مجھے اندازہ ہے کہ کچھ حضرات قائداعظمؒ کی بیٹی کی وادیا سے شادی کو محمد علی جناحؒ کی انا کا مسئلہ قرار دے کر ''ذاتیات'' کا رنگ دینگے لیکن اگر سارے واقعے کو اپنے صحیح پس منظر میں پرکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قائداعظمؒ کیلئے یہ انا کا نہیں بلکہ دین ہی کا مسئلہ تھا۔ سٹینلے والپرٹ اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' میں لکھتا ہے کہ دینا نے وادیا سے شادی کا ارادہ کیا تو اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد سے کیا۔ جنہوں نے کبھی اسکی بات کو ٹالا نہیں تھا۔ قائداعظمؒ نے اپنی بیٹی کو اس فیصلے سے باز رکھنے کیلئے بہت سمجھایا اور کہا کہ ہندوستان بہتر سے بہتر مسلمان نوجوانوں سے بھرا پڑا ہے تم جس مسلمان نوجوان کو بھی منتخب کروگی وہ تم سے شادی کرنا اعزاز سمجھے گا۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی بھی مسلمان نوجوان سے شادی کرو۔ جب دینا اپنی بات پر اڑی رہی تو قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر اس سے منہ موڑ لیا کہ آج سے میرا اور تمہارا رشتہ ختم ہے، جو چاہو کرو۔ قائداعظمؒ کا فقط یہ اصرار تھا کہ تم مسلمانوں میں شادی کرو، وہ کسی مخصوص نوجوان یا خاندان میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے کہ یہ ان کے لئے ذاتی انا کا مسئلہ ہوتا۔ انہوں نے مسلمان کی شرط لگا کر واضح کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ دین

کا ہے، دنیا کا نہیں۔

مولانا حسرت موہانی نہایت درویش، صالح حق گو، بیباک اور کھرے انسان تھے۔ وہ شاید مسلم لیگ کے واحد رکن تھے جو بھری میٹنگوں میں اٹھ کر قائداعظم پر تنقید کر لیتے اور پھر قائداعظمؒ اپنے موقف کے حق میں دلائل دے کر انہیں مطمئن کرتے۔ انہوں نے ساری زندگی مسلم لیگ کے ساتھ رہ کر جدوجہد کرتے گزار دی، کئی بار جیل گئے اور قید بامشقت بھگتی۔ حصول پاکستان انکا سب سے بڑا خواب تھا لیکن انہوں نے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرنے کی بجائے باقی ماندہ زندگی ہندوستان میں ہی گزار دی کیونکہ ان کی جدوجہد مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کیلئے تھی نہ کہ اپنے ذاتی مفاد کیلئے..... مالی تنگی اور عسرت کے باوجود مولانا حسرت موہانی نے گیارہ حج کئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ عمرے نصیب کئے۔ مولانا حسرت موہانی کا کہنا ہے کہ ایک بار وہ صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں قائداعظمؒ کے گھر پہنچے کیونکہ انہیں علم تھا کہ قائداعظمؒ سحر خیز ہیں۔ چوکیدار نے انہیں انتظار کے کمرے میں بٹھا دیا کہ ابھی صاحب باہر نہیں نکلے آپ انتظار کریں۔ مولانا حسرت موہانی قدرے بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ کچھ دیر تو انتظار کرتے رہے پھر سوچا کہ میں خود ہی ان کو تلاش کر لیتا ہوں۔

مولانا حسرت موہانی کا بیان ہے کہ وہ کمرے کے درمیانی دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے اور اس کمرے کا پردہ اٹھا کر اگلے کمرے میں گئے تو انہیں کسی شخص کے رونے اور آہ وزاری کی آواز آئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ رونے کی آواز سن کر پریشان ہوئے اور رک گئے..... پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون رو رہا ہے، انہوں نے خاموشی سے اگلے کمرے کا پردہ سرکا کر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ قائداعظمؒ سجدے میں گرے ہوئے تھے اور گڑگڑا کر رو رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کا کہنا ہے کہ وہ یہ منظر دیکھ کر دبے پایاں واپس آ گئے۔ ظاہر ہے سجدے میں گر کر وہی شخص گڑگڑائے گا جس کے دل میں خوف خدا ہو اور جس کا باطن تیقن، یقین کامل، حب الٰہی اور سوز دروں کے نور سے مالا مال ہو۔

مولانا حسرت موہانی کا ذکر ہوا تو یاد آیا کہ محترم ظہیر الاسلام فاروقی صاحب نے اپنی کتاب ''مقصد پاکستان'' میں لکھا ہے کہ مولانا حسرت موہانی 1946ء کے انتخابات کے سلسلے میں ملک بھر کے دورے کر رہے تھے۔ ایک بار ریل کے سفر کے دوران مستقبل کے حوالے سے گفتگو چل نکلی تو مولانا نے کہا آپ فکر نہ کریں انشاءاللہ پاکستان بن کر رہے گا' اس سے آگے کی فکر کریں۔

پیر علی محمد راشدی صاحب نے پوچھا کہ آپکو اس قدر یقین کیوں ہے کہ پاکستان بہرحال بن کر رہے گا کیونکہ کانگریس اور انگریز حکومت دونوں اس مطالبے کے مخالف ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے اسلئے یقین ہے کہ مجھے خواب میں حضور نبی کریم کی زیارت ہوئی اور آپ نے مجھے قیام پاکستان کی بشارت دی۔ آپ اس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا حسرت موہانی خود کتنی عظیم اور روحانی حوالے

سے کتنی بزرگ ہستی تھے جنہیں خواب میں حضور کی زیارت نصیب ہوئی اور جنہیں خود حضورؐ نے بشارت دی۔

قائداعظمؒ کے کردار کی عظمت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور زمانہ گواہ ہے کہ وہ ایک سچے' کھرے' با اصول اور باوقار انسان تھے۔ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کی عظمت کے معترف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند و پاکستان ان پر جان چھڑکتے تھے اور ان پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ میرے نزدیک قائداعظمؒ کی راست گوئی اور عظمت کردار سیرت النبی کے گہرے مطالعے کا اعجاز تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ قائداعظمؒ کوئی روحانی بزرگ' صوفی یا مذہبی شخصیت نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا۔ وہ بار بار کہتے رہے کہ میں ''مولانا'' نہیں' ایک عام مسلمان ہوں۔ بشری کمزوریوں سے پاک شخصیات صرف انبیاء اور اولیاء کی ہوتی ہیں۔ قائداعظمؒ بھی بہرحال ایک بشر ہی تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں وہ نمود و نمائش' منافقت اور دوہرے معیار سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی تقریریں اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ان کے باطن اور دل کی گہرائیوں کی عکاسی کرتے تھے اور انہوں نے کبھی عوام کو جذبات میں بہلانے' بہکانے یا اپنے بارے میں غلط تاثر دینے کی کوشش نہیں کی۔

قائداعظمؒ کے مزاج کے اس پس منظر میں ان کی تقریریں پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے محبت' اسلام کی بقا اور عظمت' اسوہ حسنہ' اپنے ضمیر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی جیسے احساسات و تصورات ان کے خون میں شامل تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریریں ان الفاظ اور ترکیبات سے اس قدر معطر ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر میں مسلمان اور اسلام کے الفاظ سجے ہوئے ہیں۔ ان تقریروں کو پڑھ کر یوں احساس ہوتا ہے کہ جیسے قائداعظمؒ ہمہ وقت مسلمان اور اسلام کے بارے سوچتے رہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے حقوق' مسلمانوں اور اسلام کے مستقبل کے حوالے سے سینکڑوں تقریریں کیں اور ان میں بار بار کہا کہ ہمیں کہیں سے بھی جمہوریت کا سبق لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے جمہوریت آج سے تیرہ سو برس پہلے سیکھ لی تھی' جمہوریت ہمیں اسلامی ورثے میں ملی ہے' اسوہ حسنہ ہمارے لئے نمونہ ہے اور نبی کریمؐ نے جس طرح یہودیوں اور دوسری اقلیتوں سے معاہدے کئے ہم انہی اصولوں سے روشنی حاصل کر کے اقلیتوں کو برابر کے حقوق دیں گے۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ بار بار یہ باتیں صرف اس لئے کرتے رہے کہ یہ ان کی سوچ و فکر اور باطنی شخصیت کا پختہ حصہ تھیں اور وہ ان پر مکمل یقین رکھتے تھے ورنہ وہ عوامی داد یا سستی شہرت سے ہمیشہ دور رہے۔

مسلمانوں سے بے لوث محبت' اسلام سے گہرا لگاؤ' ضمیر کی گواہی اور خدا کے سامنے جوابدہی صرف اور صرف ایک سچے مسلمان کی شخصیت کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں اور میرے نزدیک یوم حساب کا خوف بخشش کا ذریعہ ہے۔ اس حوالے سے قائداعظمؒ کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1939ء میں کی گئی تقریر کے چند فقرے نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں انہیں پڑھئے اور غور کیجئے۔ ان الفاظ کے باطن میں جھانکئے تو آپ کو اصل جناح کا سراغ ملے گا' وہ جناح جو بظاہر انگریزی بولتا' مغربی لباس پہنتا اور مغربی طور طریقوں پر

عمل کرتا تھا لیکن وہ باطنی طور پر اس کے برعکس تھا۔

''مسلمانو میں نے دنیا کو بہت دیکھا' دولت' شہرت اور عیش وعشرت کے بہت لطف اٹھائے اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی..... میں آپ کی داد اور شہادت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل' ایمان اور میرا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا' جناح تم مسلمانوں کی حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبے میں علم اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔'' (روزنامہ انقلاب 22 اکتوبر 1939ء)

یوم حساب خدا کے حضور سرخروی کا خیال' مسلمانوں اور اسلام کی سربلندی کا علم بلند کئے ہوئے مرنے کی آرزو اور رضائے الٰہی کی تمنا صرف اور صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو سرتاپا سچا مسلمان اور پکا مومن ہو اور جس کا باطن خوف خدا کے نور سے منور ہو۔ غور کیجئے کہ جب قائداعظمؒ نے یہ تقریر کی اس وقت ان کی عمر تقریباً 53 سال تھی اور ان کی شہرت اوج ثریا پر تھی۔

اس پس منظر میں جب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک خواب کا احوال پڑھتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خواب سچا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نہ صرف عالم وفاضل شخصیت اور مفسر قرآن تھے بلکہ ایک بلند روحانی مرتبہ بھی رکھتے تھے اور ان کے لاکھوں معتقدین ہندو پاکستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ''تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی'' کے مصنف منشی عبدالرحمٰن نے صفحہ نمبر 111 پر لکھا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے خواہرزادے مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت تھانوی نے مجھے بلایا اور فرمایا ''میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدان حشر معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیا' علما اور صلحا کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور مسٹر محمد علی جناح بھی عربی لباس پہنے ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی جناح آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔'' یقیناً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا اتنا صلہ تو ضرور ہوگا۔ انہی مولانا اشرف علی تھانوی نے 4 جولائی 1943ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو طلب کیا اور فرمایا ''1940ء کی قرارداد پاکستان کو کامیابی نصیب ہوگی۔ میرا وقت آخری ہے' میں زندہ رہتا تو ضرور کام کرتا' مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن قائم ہو' قیام پاکستان کے لئے جو کچھ ہو سکے کرنا اور اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر ابھارنا۔ تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا۔'' (بحوالہ ''قائداعظمؒ کا مذہب وعقیدہ'' از منشی عبدالرحمٰن صفحہ نمبر 249 اور ''قائداعظمؒ کی شخصیت کا

روحانی پہلو' از ملک حبیب اللہ صفحہ نمبر 60-59)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قیام پاکستان سے کئی برس قبل اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ پاکستان قائم ہوا' مولانا ظفر عثمانی نے تھانوی صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی اور سوا پانچ سال قبل کی گئی پیشین گوئی کے مطابق قائداعظمؒ کی نماز جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔

قائداعظمؒ سیاست میں ''مذہب'' (مصنف کی مراد غالباً فرقہ واریت سے ہے۔ مدیر) کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے اور شاید وہ سمجھتے تھے کہ ''مذہب'' اور سیاست کے ملاپ سے انتہا پسندی کے دروازے کھلیں گے جس سے مسلمانوں اور بعد ازاں پاکستانی قوم کا اتحاد بری طرح متاثر ہوگا۔

7 فروری 1935ء کو مرکزی قانون ساز اسمبلی میں آزاد رکن کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا کہ ''میں حزب مخالف کے قائد سے پوری طرح متفق ہوں کہ مذہب' نسل اور زبان کو سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے' مذہب انسان اور خدا کا معاملہ ہے لیکن براہ کرم غور کیجئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' وہ مذہب کا معاملہ نہیں بلکہ میں تو اقلیتوں کی بات کر رہا ہوں جو ایک سیاسی مسئلہ ہے کیونکہ ہمارے ملک میں اقلیتوں کے مسائل ہیں اور ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہے''۔ (قائداعظم کی تقریریں جلد اول از خورشید احمد خان یوسفی صفحہ 69-70) اسی تقریر میں آگے چل کر اقلیت کی تشریح کرتے ہوئے قائداعظمؒ کہتے ہیں کہ اقلیت کا مذہب' تمدن' کلچر اور بعض اوقات آرٹ میوزک بھی اکثریت سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز میں محمد علی جناح مسلمانوں کے بحیثیت اقلیت تحفظات کے خلاف تھے۔

محمد علی جناح نے اولین بار 28 جولائی 1904ء کو کانگرس کے اجلاس میں شرکت کی۔ کانگرس کے اجلاس منعقدہ 28 دسمبر 1906ء میں ایک مسلمان ممبر نے ایک قرارداد کے ذریعے مسلمانوں کے لئے کوٹے کا مطالبہ کیا جس کی مخالفت کرتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابر سمجھا جائے اور ان سے ایک جیسا سلوک کیا جائے کیونکہ کانگرس کی بنیاد ہی برابری کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ (ورکس آف قائداعظمؒ از ڈاکٹر ریاض احمد جلد اول صفحہ 81)

یہی محمد علی جناح بعد ازاں مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما بن کر ابھرے اور قیام پاکستان تک مسلمانوں کے لئے نہ صرف حقوق اور تحفظات بلکہ جداگانہ حق رائے دہی کے لئے دن رات جدوجہد کرتے رہے۔ کانگرس اور ہندو اکثریت کے ارادے بھانپنے کے بعد قائداعظمؒ نے مسلمانوں کو اقلیت کے چکر سے نکال کر ایک منفرد قوم ثابت کیا اور اسی قومیت کے حوالے سے ایک علیحدہ خطہ زمین کے حصول کو اپنی منزل بنالیا۔

دراصل قائداعظمؒ کو زندگی بھر اقلیتوں کے مسئلے سے واسطہ رہا اور وہ اس سے نپٹنے کی کوششیں کرتے رہے۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت تھے اور اس اقلیت کے سب سے بڑے رہنما محمد علی جناح تھے۔ چنانچہ متحدہ ہندوستان کا خواب ٹوٹنے کے بعد (جس کا نقطۂ عروج 1948ء کی نہرو رپورٹ کو قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ قائداعظمؒ نے اسے پارٹنگ آف دی ویز یعنی راستوں کی علیحدگی قرار دیا تھا) قائداعظمؒ پہلے پہل مسلمان اقلیت کے حقوق اور بعدازاں مسلمان قوم کے حقوق کے لئے اس وقت تک مسلسل لڑتے رہے جدوجہد کرتے رہے جب تک قیام پاکستان کے امکانات واضح نہیں ہوئے۔ مسلمان اقلیت سے مسلمان قوم کے سفر میں 1940ء کی قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان ایک طرح سے اہم ترین سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بعد قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کا مؤقف یہ رہا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ہر تعریف، معیار اور تصور کے مطابق ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قومیت کی اہم ترین بنیاد مذہب تھی۔ اسی طرح جب قیام پاکستان کا مرحلہ قریب آیا تو قائداعظمؒ کے لئے سب سے اہم سوال اور مسئلہ پھر اقلیتوں کا تھا کیونکہ پاکستان میں بھی کئی مذہبی اقلیتیں آباد تھیں اور ادھر ہندوستان میں بھی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہی تھی جس کے تحفظ کے لئے قائداعظمؒ پریشان رہتے تھے۔ (ملاحظہ ہو قائداعظمؒ کی پریس کانفرنس 14 جولائی، بیانات 15 ستمبر اور 17 ستمبر، 25 اکتوبر 1947ء) چنانچہ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل اور چند ماہ بعد تک ان سے بار بار اقلیتوں کے مستقبل کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے رہے جس کی وہ بار بار وضاحت کرتے رہے۔ اس دور میں قائداعظمؒ نے جو تقاریر کیں یا بیانات دیئے ان کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے ان کا مطالعہ اس مسئلے کے تناظر میں کرنا چاہئے۔

اس ضمن میں قائداعظمؒ کے خیالات سمجھنے کے لئے ان کی اس پریس کانفرنس کا حوالہ دینا ضروری ہے جو انہوں نے پاکستان کا گورنر جنرل نامزد ہونے کے بعد 14 جولائی 1947ء کو نئی دہلی میں کی۔ اقلیتوں کے ضمن میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''میں اب تک بار بار جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر قائم ہوں، ہر اقلیت کو تحفظ دیا جائے گا۔ ان کی مذہبی رسومات میں دخل نہیں دیا جائے گا اور ان کے مذہب، اعتقاد، جان و مال اور کلچر کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ وہ ہر لحاظ سے پاکستان کے برابر کے شہری ہوں گے۔'' اسی پریس کانفرنس میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا پاکستان ایک مذہبی (Theocratic) ریاست ہوگی؟ تو قائداعظمؒ نے کہا کہ ''آپ مجھ سے ایک فضول سوال پوچھ رہے ہیں۔ گویا میں اب تک جو کچھ کہتا رہا ہوں وہ رائیگاں گیا ہے۔ آپ جب جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال قبل سیکھ لی تھی۔'' (بحوالہ ''جناح: تقریریں اور بیانات 48-1947'' از ایس ایم برک مطبوعہ آکسفورڈ پریس صفحات 16-12) سوال یہ ہے کہ تیرہ سو برس قبل مسلمانوں نے کون سی جمہوریت سیکھی تھی؟ کیا وہ سیکولر جمہوریت تھی یا نظریاتی اور اسلامی جمہوریت؟

اس بحث کی ایک اہم کڑی قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہے جوانہوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا صدر منتخب ہونے پر اسمبلی میں کی۔ یہی وہ تقریر ہے جس کی توضیح یا تشریح کر کے کچھ حضرات یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان کے لئے سیکولر جمہوری نظام چاہتے تھے جبکہ دوسرا مکتبہ فکر اس توضیح سے اس بنیاد پر اختلاف کرتا ہے کہ اول تو قائداعظمؒ کی تقریر سے ہرگز یہ مفہوم نہیں نکلتا اور دوم یہ تاثر غیر منطقی ہے کیونکہ قائداعظمؒ جیسے عظیم لیڈر کی ایک تقریر کو ان کی دوسری لاتعداد تقریروں اور بیانات سے جوانہوں نے اس سے قبل یا بعد ازاں دیئے الگ یا علیحدہ کر کے صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے گیارہ اگست کی تقریر میں کیا کہا جو اس قدر بحث ونزاع کا سبب بن گیا۔ دراصل انہوں نے اس تقریر میں ان بنیادی مسائل کی نشاندہی کی جو پاکستان کو اس وقت درپیش تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بابائے قوم (فادر آف نیشن) ہونے کے ناطے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ اس تقریر کا مکمل ادراک حاصل کرنے کے لئے پوری تقریر کو اس کے سیاق وسباق اور پس منظر میں پڑھنا ضروری ہے۔ قائداعظمؒ نے کہا کہ ہم آپ کی مدد سے اس اسمبلی کو مثالی بنائیں گے۔ حکومت کا پہلا فرض امن عامہ قائم کرنا ہے تاکہ شہریوں کی جائیداد اور مذہبی اعتقادات کی حفاظت کی جا سکے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رشوت اور کرپشن ہے۔ اس اسمبلی کو اس زہر کے خاتمے کے لئے مؤثر اقدامات کرنے ہیں۔ ایک اور لعنت بلیک مارکیٹنگ یعنی چور بازاری ہے جس کا تدارک آپ کو کرنا ہے۔ اسی طرح ہمیں اقربا پروری اور ظلم وزیادتی کو بھی کچلنا ہے۔ مجھے علم ہے کہ کچھ لوگوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا۔

میرے نزدیک اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اگر ہم پاکستان کو خوشحال اور عظیم ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ہمہ وقت عوام کی خوشحالی اور بہتری پر توجہ دینا ہوگی۔ اگر آپ ماضی کی تلخیوں کو دفن کر کے رنگ ونسل اور عقیدے کے اختلافات کو پس پشت ڈال کر تعاون اور برابری کی فضا میں کام کریں گے تو آپکی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ اگر ہم اس جذبے کے ساتھ کام کریں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریت اور اقلیت..... مسلمان اور ہندو..... کے درمیان پیچیدگیاں ختم ہو جائیں گی کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، ویش، کھتری، شودر، بنگالی اور مدراسی ہیں۔ یہی تقسیم ہندوستان کی آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہئے۔ آپ آزاد ہیں مندر میں پوجا کریں یا مسجد میں عبادت کریں۔ آپ کا کس مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق ہے، اس سے حکومت کا سروکار نہیں۔ کسی زمانے میں انگلستان کے حالات نہایت خراب تھے اور وہاں رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا آغاز ان سے بہت بہتر ہے۔ آج انگلستان میں رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان اختلافات ختم ہو چکے ہیں اور وہ اپنے ملک کے یکساں شہری ہیں۔ اگر آپ بھی اپنے سامنے یہی آئیڈیل رکھیں تو وقت گزرنے

کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق مٹ جائے گا' مذہب کے حوالے سے نہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا مذہب ہوتا ہے بلکہ سیاسی حوالے سے کیونکہ سبھی ایک ریاست کے شہری ہوں گے۔'' (تفصیل کیلئے دیکھیں ایس ایم برک بحوالہ گذشتہ صفحات 29-25)

اس تقریر کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نفس مضمون اور مدعا اقلیتوں کو احساس تحفظ اور بحیثیت شہری برابری کا پیغام دینا ہے اور قوم کو اتحاد کی تلقین کرنا ہے جس میں پاکستان کی ترقی کا راز مضمر ہے کیونکہ ہندوستان میں یہ پراپیگنڈہ جاری تھا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگی جہاں اقلیتوں کو غلام بنا کر رکھا جائے گا۔ اس تقریر میں قائداعظمؒ نے رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کا ذکر کیا جو کہ عیسائیت کے دو فرقے ہیں' وہ اسلام اور ہندومت کی مانند دو مختلف مذاہب نہیں۔ اس تقریر سے قبل اور بعد ازاں بھی قائداعظمؒ اقلیتوں کو یقین دہانیاں کراتے رہے اور بار بار یہ کہتے رہے کہ Tolerance اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے 14 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے بھی اپنے اسی نقطہ نظر کو دہرایا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اقلیتوں کے حوالے سے مغل بادشاہ اکبر کی فراخدلی کا ذکر کیا تھا جس کے جواب میں قائداعظمؒ نے کہا کہ ''اکبر بادشاہ نے جس فراخدلی کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ اس کا آغاز تیرہ سو برس پہلے ہو گیا تھا جب ہمارے نبی کریم ﷺ نے فتح کے بعد نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر یہودیوں اور عیسائیوں سے فراخدلانہ سلوک کیا اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے''۔

میرا تاثر یہ ہے کہ گیارہ دسمبر کی قائداعظمؒ کی تقریر کا قصد اقلیتوں کو احساس تحفظ دینا تھا نہ کہ کسی سیکولر نظام کی بنیاد رکھنا۔ میرے اس تاثر کی تصدیق قائداعظمؒ کے ایک انٹرویو سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے 25 اکتوبر 1947ء کو ''رائٹر'' کے نمائندے کو دیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ میں دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریر (11 اگست) میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ اقلیتوں سے پاکستان کے شہریوں جیسا سلوک کیا جائے گا اور ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل ہوں گے۔ پاکستان غیر مسلم اقلیتوں میں احساس تحفظ اور اعتماد پیدا کرنے کے لئے سب کچھ کرے گا۔ (بحوالہ ایس ایم برک صفحہ 61)

مشکل یہ ہے کہ ہمارے دانشور حضرات 11 اگست والی تقریر کی تشریح و توضیح پر تو بہت زور صرف کرتے ہیں لیکن 25 اکتوبر والی تقریر کا ذکر نہیں کرتے جس میں خود قائداعظمؒ نے گیارہ اگست کی تقریر کے حوالے سے اپنے مدعا کی وضاحت کی تھی۔ مختصر یہ کہ ہمارے دانشوروں کا ایک طبقہ قائداعظمؒ کی محض ایک تقریر کے چند فقروں کو اپنے سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنا من پسند مفہوم نکال لیتا ہے اور پھر یہ اعلان کر دیتا ہے کہ قائداعظمؒ سیکولر نظام کے حامی تھے۔

یہ بات ثابت ہو چکی بلکہ طے ہو چکی کہ قائداعظمؒ نجی زندگی میں مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے ذاتی زندگی میں جو اہم فیصلے کئے ان میں اسلام کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔انہوں نے اسلام' قرآن اور سیرت النبیؐ کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور جب وہ بار بار اپنی تقریروں میں یہ کہتے تھے کہ **قرآن** ہماری سوچ کا منبع ہے' اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسوہ حسنہ ہمارے لئے ایک نمونہ ہے تو یہ باتیں محض زبان کا کارنامہ نہیں تھیں بلکہ ان کے تیقن اور باطن کا حصہ تھیں اور ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ سیاسی زندگی کے حوالے سے چار دہائیوں پر مشتمل ان کی سینکڑوں تقریریں' بیانات اور انٹرویوز اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ انہیں اسلام سے گہرا لگاؤ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہرگز مولوی' صوفی یا مذہبی قسم کے انسان نہیں تھے۔ وہ سچائی' راست گوئی' اصول پرستی' اخلاص' یقین محکم' کردار کی عظمت' اسلام اور مسلمانوں سے بے لوث سچی محبت کی اعلیٰ مثال تھے خاص طور پر قیام پاکستان کے بعد کی تقریروں میں ان کے اقوال وافکار پر مذہب کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور انہی تقریروں کا غور سے مطالعہ کر کے قائداعظمؒ کا تصور پاکستان سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے کس قسم کا سماجی وسیاسی نظام' دستور اور حکومتی ڈھانچہ چاہتے تھے۔لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی اور وہ اپنے اس خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

یوں تو قائداعظمؒ کی تقاریر میں اس قسم کے بہت سے حوالے ملتے ہیں لیکن میں اس بحث کو سمیٹنے کے لئے فقط چند ایک مطبوعہ بیانات کا ذکر کروں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ قائداعظمؒ کے خیالات میں ایک تسلسل تھا اور وہ مسلسل کیا کہتے رہے' یہی بیانات اس امر کی شہادت دیں گے کہ کیا قائداعظمؒ سوچ کے حوالے سے سیکولر تھے؟ کیا وہ پاکستان کے لئے ایک سیکولر جمہوری نظام چاہتے تھے؟

نومبر 1945ء میں قائداعظمؒ نے پشاور میں کہا ''آپ نے سپاسنامہ میں مجھ سے پوچھا ہے کہ پاکستان میں کونسا قانون ہوگا۔ مجھے آپ کے سوال پر سخت افسوس ہے۔ **مسلمانوں کا ایک خدا' ایک رسولؐ اور ایک کتاب ہے' یہی مسلمانوں کا قانون ہے اور بس**.....اسلام پاکستان کے قانون کی بنیاد ہوگا اور پاکستان میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا''۔(بحوالہ گزشتہ ملک حبیب اللہ صفحہ 123)14 فروری 1947ء کو شاہی دربار سبی' بلوچستان میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبرؐ اسلام نے دیا ہے۔ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں''۔30 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''اگر ہم قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کریں تو بالآخر فتح ہماری ہوگی.....میرا آپ تمام لوگوں سے یہی مطالبہ ہے کہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔(بحوالہ رفیق افضل قائداعظمؒ کی تقاریر صفحہ 8-447)

25 جنوری 1948ء کو عید میلاد النبیؐ کے موقع پر کراچی بار ایسوسی ایشن کے استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے وکلاء کے سامنے ان حضرات کو بے نقاب کیا جو ان کے حوالے سے غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے۔اس وقت قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل

بھی تھے اس لئے ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ''پالیسی بیان'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ قائداعظمؒ کے ان الفاظ پر غور کیجئے اور ان الفاظ کے آئینے میں ان چہروں کو تلاش کیجئے جنہیں قائداعظمؒ نے شرارتی اور منافق کہا۔ قائداعظمؒ نے کہا ''میں ان لوگوں کے عزائم نہیں سمجھ سکا جو جان بوجھ کر شرارت کر رہے ہیں اور یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں ہوگی۔ ہماری زندگی پر آج بھی اسلامی اصولوں کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوتا تھا۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے اور مساوات اور انصاف کا سبق دیا ہے اس لئے کسی کو بھی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں''۔ (بحوالہ رفیق افضل صفحہ 455)

پھر فروری 1948ء میں قائداعظمؒ نے امریکی عوام کے نام ایک ریڈیو پیغام میں یہ واضح الفاظ میں کہہ کر نہ صرف ہر قسم کے شکوک وشبہات کی دھند صاف کر دی بلکہ اس بحث کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمیٹ دیا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا ''پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی دستور بنانا ہے مجھے علم نہیں کہ اس کی حتمی شکل وصورت کیا ہوگی؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا آئین جمہوری قسم کا ہوگا جسے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح لاگو ہوتے ہیں جس طرح تیرہ سو برس قبل ہوتے تھے۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے اور مساوات اور انصاف کا سبق دیا ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے امین اور وارث ہیں اور دستور سازی میں انہی سے راہنمائی حاصل کی جائے گی۔ بہرحال پاکستان ایک تھیوکریٹ (مذہبی) ریاست نہیں ہوگی اور یہاں تمام اقلیتوں' ہندو' عیسائی' پارسی کو بحیثیت شہری وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہوں گے''۔ (ایس ایم برک صفحہ 125)

قائداعظمؒ کی تقریروں کو پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ درمیانی فاصلوں کے باوجود وہ ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جن میں کہیں بھی جھول یا انحراف موجود نہیں۔ وہ شروع سے آخر تک تسلسل سے کہتے رہے ہیں کہ قرآن ہماری سوچ وفکر کا منبع اور راہنما ہے' اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے' سیرت النبیؐ ہمارے لئے اعلیٰ ترین نمونہ ہے' جمہوریت' مساوات اور انصاف ہم نے اسلام سے سیکھا ہے اور اسلام نے جمہوریت کی بنیاد تیرہ سو سال قبل رکھ دی تھی اس لئے ہمارے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور یہ کہ ہمارے نبی ﷺ نے یہودیوں' عیسائیوں سے جس فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا ہم اس پر عمل کریں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی جائے گی وہ سازشی اور منافق ہیں اور آخر میں یہ کہہ کر تمام شکوک وشبہات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی کہ پاکستان کا آئین جمہوری ہوگا اور اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قائداعظمؒ ذہنی طور پر سیکولر تھے اور کیا وہ پاکستان کے لئے کسی سیکولر نظام کا خواب دیکھتے تھے؟

حامد میر

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

نواز شریف اور عمران خان ایک دوسرے کے سیاسی مخالف ہیں لیکن دونوں نے ایک کام بہت اچھا کیا ہے۔ دونوں نے گلگت بلتستان کا دورہ کیا اور کوئٹہ والوں کو بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ گلگت بلتستان اور کوئٹہ کے علاوہ کراچی ایک طویل عرصے سے فرقہ وارانہ کشیدگی کا شکار ہیں۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد دہشت گردی کے خلاف شروع کی جانے والی نام نہاد جنگ نے پاکستان میں خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی ہے اور پاکستان پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ اس صورتحال میں نواز شریف اور عمران خان جیسے رہنماؤں کا فرقہ وارانہ دہشت گردی کے شکار مظلومین کے ساتھ کھڑے ہونا مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن ہے۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین بھی بار بار یہ اپیل کر رہے ہیں کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے سیاسی و دینی قیادت کو فوری اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی طور پر اس مسئلے کا تعلق قانون کی بالادستی سے ہے اور قانون کی بالادستی اسی صورت میں ممکن ہے جب ریاستی ادارے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے بجائے مل جل کر قانون کی عمل داری قائم کریں۔ اس سلسلے میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ سپریم کورٹ نے بلوچستان بدامنی کیس سمیت کچھ دیگر اہم مقدمات کی سماعت کوئٹہ میں شروع کر دی ہے اور بلوچستان کے لوگوں کو پیغام دیا ہے کہ سپریم کورٹ ان کے ساتھ کھڑی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت بلوچستان میں سپریم کورٹ موثر ترین ریاستی ادارے کے طور پر سرگرم ہے اور اگر دیگر ادارے بھی سپریم کورٹ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں تو بلوچستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے علاوہ لاپتہ افراد اور بم دھماکوں جیسے سنگین مسائل پر قابو پانا مشکل نہ ہوگا۔ ریاستی اداروں کو چاہئے کہ بلوچستان کے دارالخلافے کوئٹہ کو اپنے لئے ایک چیلنج بنائیں۔ کوئٹہ میں امن قائم ہو جائے تو اس کے اثرات صرف گلگت بلتستان اور خیبر پختونخوا تک نہیں بلکہ پنجاب اور سندھ تک بھی پھیلیں گے۔ ہماری سیاسی و دینی قیادت کچھ نہ کرے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو کر اقبال کے اس پیغام کو دہرا دے کہ:

وا نہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے
دیکھ: کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے

کیا ہماری قومی اسمبلی اور سینٹ کے ارکان علامہ اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں کوئی ایسی قانون سازی نہیں کر سکتے کہ مساجد اور امام بارگاہوں سے قابل اعتراض تقاریر کرنے والوں کے خلاف خصوصی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں؟ اقبالؔ نے کہا تھا کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

علامہ اقبالؔ صرف ایک شاعر نہیں بلکہ فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ رات کے وقت تاریکی میں چلتے وقت ٹھوکر کھانے کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ آؤ سب مل کر آگے بڑھیں۔ طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کے بت ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیں۔ اقبالؒ نے ملاؤں کی طرف سے مسلمانوں میں پیدا کی گئی فرقہ وارانہ تقسیم کو ایک بہت مہلک بیماری قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

آج ہمارے ملک میں یہ بحث جاری ہے کہ فلاں شیعہ تھا، اسماعیلی شیعہ تھا یا اثناء عشری شیعہ تھا۔ فلاں سنی تھا لیکن بریلوی تھا کہ دیوبندی تھا؟ اگر کوئی کہہ دے کہ صاحب میں نہ شیعہ ہوں نہ سنی بلکہ صرف مسلمان ہوں تو مسلمانی کے دعویدار کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور پھر بڑے اہانت آمیز انداز میں کہا جاتا ہے تو کیا آپ ہمارے مسلک سے انکار کر رہے ہیں' اقبالؔ نے اسی قسم کے مسلک پسندوں کے بارے میں کہا تھا کہ:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لیکن ہمیں اپنی حقیقت کو خرافات کے سمندر میں ڈوبنے سے بچانا ہے۔ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ قائداعظمؒ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے یا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تھے۔ ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ ہمارے صدر، وزیراعظم، اپوزیشن لیڈر اور دیگر سیاسی و دینی قائدین ایک ہی مسجد میں ایک امام کے پیچھے نماز ادا کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے مسلک کو اسلام پر ترجیح دینے والے کہیں کہ وہ کون سی مسجد ہے جہاں شیعہ اور سنی بیک وقت اکٹھے نماز ادا کر سکتے ہیں؟ جناب پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد کی مسجد میں اہل تشیع اور اہل سنت اکٹھے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اہل تشیع کہیں کہ ہم تو سنی امام کے پیچھے نماز ادا کرلیں گے لیکن کیا اسی مسجد میں اہل سنت ہمارے شیعہ امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کے لئے تیار ہوں گے؟ اس کا حل یہ ہے کہ ایک نماز سنی امام پڑھادے اور ایک نماز شیعہ امام پڑھادے۔ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکانا ہے۔ سر کھلے ہاتھوں سے بھی جھک جائے گا اور بند ہاتھوں سے بھی جھک جائے گا۔ ایک دفعہ ہماری سیاسی و دینی قیادت اکٹھے نمازیں ادا کرتے نظر آئے گی تو صدیوں پرانے فرقہ وارانہ اختلافات شاید ختم نہ ہوسکیں لیکن کشیدگی ضرور ختم ہوجائے گی اور کشیدگی کے خاتمے سے ہمارے دشمنوں کو ہماری ہی صفوں میں سے ایسے گمراہ نوجوان ملنا بند ہوجائیں گے جو جہاد کے نام پر فساد پھیلا رہے ہیں۔ ان فسادیوں کا مقابلہ صرف اور صرف اتحاد سے ہوگا۔ ہم ایک دوسرے سے سیاسی اختلاف ضرور کریں لیکن فسادیوں کے خلاف متحد ہوجائیں جن کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

(بشکریہ جنگ)